لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

عالم انسانی کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ . . .

اغراض وتعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالکل آزاد اور بے تعلق ہوکر،
عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی جائیں،
جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے،
اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور انسانی موسائٹی،
اس وقت سخت خطرے سے دوچار اور موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہے،
یہ حقیقتیں اپنے اپنے زمانے میں پیغمبروں نے بیان کی تھیں،
اور ان کے لئے سخت جد و جہد کی تھی،
یہ حقیقتیں اب بھی زندہ ہیں،
لیکن سیاسی تحریکوں، مادی تنظیموں اور قومی خود غرضیوں نے،
گرد و غبار کا ایسا طوفان کھڑا کر دیا ہے کہ . . . . . .
یہ روشن حقیقتیں ان کے اوٹ میں اوجھل ہو گئی ہیں،
لیکن انسانی ضمیر ابھی مردہ اور انسانی ذہن ابھی مفلوج و معطّل نہیں ہوا ہے،
اگر پوری بے غرضی، پورے یقین اور خلوص کے ساتھ،
ان حقیقتوں کو عام فہم اور دلنشیں انداز میں بیان کیا جائے،
تو انسانی ضمیر و ذہن اپنا کام کرنے لگتا ہے،
اور بڑی گرمجوشی سے ان حقیقتوں کا استقبال کرتا ہے،
اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
ان تقریروں میں اس کے دل کی ترجمانی اور اس کے درد کا مداوا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ایک انٹرویو سے

(انٹرویو اسی شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

Regd No. LW/NP 56

Phone 42348 / 40247

TAMEER-E-HAYAT

Fortnightly

(NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

ندوہ کے شب و روز

شاکر علی رحمانی، متعلم دار العلوم ندوۃ العلماء

اس ماہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی چار دیواری میں جو دینی، علمی، تعلیمی و ثقافتی سرگرمیاں رہیں ان میں اہم وہ تبلیغی اجتماع ہے جس نے ۲۰، ۲۱، ۲۲ مئی ۱۹۷۸ء کو دارالعلوم کی وسیع ۳۳ بیگھہ زمین اور اس کے اطراف کو فرزندان توحید کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں تبدیل کر دیا تھا، لکھنؤ پہونچنے والی تمام راہیں ۱۸ مئی سے ندوہ کی طرف بہنے لگیں اور ۲۰ مئی کو پچاس ہزار انسانوں کا ایک شہر دیکھتے ہی دیکھتے آباد ہوگیا۔ تبلیغی جماعت کی سرگرمیاں اور دعوتی خدمات اب دنیا کے تمام براعظم کا احاطہ کر چکی ہیں، آنے والے لوگوں میں ملک کی تقریباً تمام ریاستوں کے علاوہ بیرون ملک کے مجاہدین فی سبیل اللہ کی بھی ایک معتدبہ تعداد تھی، گرمی کا زمانہ، جھلسا دینے والی لو اور اس سخت موسم میں دین کی دعوت کے جذبہ اور دین کے پیام سننے اور پہنچانے کا نیک ارادہ کر کے ہزاروں افراد کا بلا کسی رواجی پروپگنڈہ کے جمع ہو جانا، اس مادی دور کا محیر العقول کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ وسیع پنڈال میں عام بیانات کے علاوہ دانشوروں، علماء اور طلبہ کی مخصوص نشستوں سے مولانا محمد عمر صاحب پالنپوری اور مولانا احمد لاٹ ندوی نے خصوصی خطاب فرمایا، ۲۶۷ جماعتیں راہ خدا میں نکلیں، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کی پراثر دعا کے ساتھ یہ اجتماع اختتام پذیر ہوا۔

دارالعلوم میں سالانہ امتحانات ماہ شعبان میں ہوتے ہیں اور ماہ رجب میں بزم خطابت و بزم سلیمانی کے انعامی جلسے امسال درجات متوسط کے طلبہ کے دارالاقامہ سلیمانیہ ہوسٹل میں اولاً یہ انعامی جلسے ہوئے اور درج ذیل طلبہ انعامات کے مستحق قرار پائے۔

بزم خطابت طبقۂ علیا: انعام اول سمیع احمد دربھنگوی۔ انعام دوم، محمد داؤد نیپالی، انعام سوم عبدالحنان پورنوی۔ طبقۂ سفلیٰ: انعام اول: فراست علی، دوم عبدالمبین رانچوی۔ سوم: ضیاء الدین پورنوی۔

تحریری مقابلہ یعنی بزم سلیمانی میں انعام اول سمیع احمد دوم غلام ربانی، سوم، محمد صابر حسین۔

طبقۂ سفلیٰ میں۔ انعام اول۔ اسد اللہ خاں، دوم شکیل احمد، سوم شہاب الدین بستوی۔

بڑے طلبہ کے دارالاقامہ میں جمعیۃ الاصلاح کے زیر اہتمام یہ انعامی مقابلے ہوئے۔

طبقۂ علیا بزم خطابت، انعام اول، عبدالوحید بستوی، دوم عبدالرشید اورنگ آبادی، سوم قیصر حسین۔ طبقۂ سفلیٰ۔ انعام اول حشمت اللہ دوم نظیر عالم شمسی، سوم راشد مالیگانوی۔

بزم سلیمانی (مقالات) طبقۂ علیا، انعام اول، عطاء الرحمٰن (بمبئی) دوم، عبدالرشید اورنگ آبادی۔ سوم، عبدالوحید بستوی۔

طبقۂ سفلیٰ، انعام اول حشمت اللہ، دوم، راشد مالیگانوی۔ سوم، عبدالقیوم کشمیری۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک سابق محبوب استاد اور مہتمم مولانا اسحٰق صاحب صدیقی سندیلوی ندوی عرصہ بعد پاکستان سے تشریف لائے، مولانا موصوف کا دارالعلوم میں پر جوش خیر مقدم کیا گیا، موصوف کے اعزاز میں جمعیۃ الاصلاح کے زیر اہتمام ایک استقبالیہ جلسہ ترتیب دیا گیا جس کی صدارت مولانا محمد رابع صاحب ندوی نے کی سلیمانیہ ہال میں طلبا و اساتذہ کی کثیر تعداد اپنے ایک سابق استاد اور مربی کو دیکھنے اور ان کے گراں قدر ارشادات کو سننے کے لئے جمع تھی، تلاوت کلام پاک کے بعد مولانا اسحٰق جلیس ندوی نے مقرر خصوصی کا تعارف کرایا، اس کے بعد بزرگ محترم کی مفصل، پرمغز اور مفید تقریر ہوئی، مولانا رابع صاحب ندوی کے صدارتی کلمات کے بعد یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

---

۱۵ جون کو بذریعہ ہوائی جہاز مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا معین اللہ صاحب ندوی عازم حجاز ہوئے، یہ حضرات جولائی کی ابتدائی تاریخوں میں مدینہ سے کراچی پہونچیں گے جہاں ۶ جولائی سے ایشیائی اسلامی کانفرنس، رابطہ عالم اسلامی کے زیر اہتمام ہو رہی ہے۔

دارالعلوم سے اس کانفرنس میں مولانا محمد الحسنی (مدیر البعث الاسلامی) اور مولانا اسحٰق جلیس ندوی (مدیر تعمیر حیات) شرکت فرمائیں گے۔ یہ دونوں حضرات ۲۵ جون کو براہ لاہور کراچی کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔

سالانہ امتحانات کی تیاریوں میں طلبہ منہمک ہو گئے ہیں۔ مسجد ہوسٹل، کتب خانہ میں مطالعہ اور تیاری کی فضا طاری ہے۔

دارالعلوم کے پرائمری اور ثانوی درجات (معہد دارالعلوم) کو موسم گرما میں ایک ماہ کی جو تعطیل ہوئی تھی وہ ۲۰ جون کو ختم ہو رہی ہے۔ سرپرستوں کی اس کی اطلاع دی جا چکی ہے۔

ANNOUNCING

JOURNAL
INSTITUTE OF MUSLIM MINORITY AFFAIRS
KING ABDULAZIZ UNIVERSITY
JEDDAH SAUDI ARABIA

A bi-annual publication devoted to an investigation of the Politics, Economics, Education, History, Literature and Sociology of Muslim minorities around the world.

FIRST ISSUE SUMMER 1978

Contributions are invited from all interested scholars and students.

Manuscripts should be typewritten (double-space) and must conform to standard research requirements.

Kindly address all correspondence to:

MANAGING EDITOR JOURNAL
INSTITUTE OF MUSLIM MINORITY AFFAIRS
KING ABDULAZIZ UNIVERSITY P.O BOX 1540 JEDDAH SAUDI ARABIA.

نرخ اشتراک اندرون ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ: ۱۲ روپے ششماہی سات روپے
فی پرچہ: ۶۰ پیسے
بیرون ہند مع محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ ۵ شلنگ
ہوائی ڈاک سے: امریکہ وکناڈا اور
یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے ملک ۲ ½ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے
بنگلہ دیش: ۱۵ روپے

لکھنؤ
تعمیر حیات
پندرہ روزہ
شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۵ | ۱۰ جون ۱۹۷۸ء — ۳ رجب ۱۳۹۸ھ | شمارہ نمبر ۱۵

اسحٰق جلیس ندوی

پرولتاری پیمانہ

ایتھوپیا کے فوجی ڈکٹیٹر نے یہ اعلان کیا کہ "دو سوشلسٹ دوست ممالک (روس اور کیوبا) اریٹریا کے باغیوں کو کچلنے کے لئے ہمارے دوش بدوش جنگ کر رہے ہیں۔ اریٹریا پر ہمارا یہ حملہ اوگاڈین پر فوجی کارروائی سے زیادہ موثر اور کامیاب ہوگا"

اور اس اعلان پر دنیا کے کمزور، غلام اور نوآبادیاتی نظام کے استحصال کا شکار عوام کے "ہمدرد" ترقی پسندوں نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔

اریٹریا میں دنیا کی سب سے بڑی سوشلسٹ طاقت روس اور اس کے حلیف کیوبا اور ایتھوپیا کس سامراج کی سرکوبی کر رہے ہیں؟ ان مظلوم، بے سروسامان مجاہدین آزادی کی جو حبشی سامراج سے اپنے جائز حقوق کے لئے گذشتہ ۲۰ سال سے برسر پیکار ہیں، جو دنیا سے انصاف کی بھیک مانگتے تھک گئے، اقوام متحدہ نے ان کے مطالبۂ آزادی کو جس قدر تسلیم کیا تھا اسے بھی دینے سے ہیل سلاسی اور اس کے جانشین جب مکر گئے تو انہوں نے گوریلا جنگ کے ذریعہ اپنی آزادی کے لئے جدوجہد شروع کی۔ ان کے اس جائز مطالبہ اور مبنی بر انصاف جدوجہد کو کچلنے کے لئے وہ حکومتیں میدان میں آگئی ہیں جنہیں دنیا بھر کے مظلوم عوام کی ہمدردی اور پشت پناہی کا دعویٰ ہے۔

پروگریسیو اور پرولتاری کہلانے والے دانشور، صحافی اور ادیب خاموش ہیں۔ اس شفاف ظلم سے انہوں نے ایسی چشم پوشی کر رکھی ہے کہ گویا یہی محنت کش اور مظلوم عوام کی عین ہمدردی اور ان کی بروقت اعانت ہے،

ترقی پسندوں کے لین دین کا مخصوص پیمانہ ہوتا ہے۔ تلنگانہ کے کسان سرخ پرچم تلے دستوری حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کرتے ہیں تو "ارض تلنگانہ کو سلام" کیا جاتا ہے لیکن "سرخ سرپرستی" سے بے نیاز ہو کر کوئی جدوجہد کیجاتی ہے تو ترقی پسند تائید اسے نصیب نہ ہوگی چاہے وہ کیسی ہی مظلوم اور مبنی بر حق و انصاف ہو۔ دنیا کے اسٹیج پر ظلم اور بربریت کے ایسے ڈرامے کئی دن ہوتے رہتے ہیں، اوگاڈین پر فوج کشی، روسی اور کیوبائی ہوا بازوں کی بمباری کس سرمایہ دار ملک کے خلاف حق و انصاف کی جنگ تھی؟ اوگاڈین میں اکثریت صومالی مسلمانوں کی ہے اور ان کا یہ جائز مطالبہ تھا کہ انہیں ایتھوپیا کے استبداد و غلامی سے نجات دی جائے، انصاف نے جب آنکھیں بند کر لیں تو بے سروسامان عوام نے ایتھوپیائی فوجوں کے استبداد کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، قریب تھا کہ وہ کامیاب ہو جائیں کہ "غریبوں" کی دادرسی کے لئے کمیونسٹ ممالک میدان میں آگئے اور تین حکومتوں کی متحدہ فوجوں نے بمبار طیاروں، ٹینکوں اور بحریہ کے ذریعہ اوگاڈین کے عوام کی جدوجہد آزادی کو کچل کر رکھ دیا۔ اب وہاں کے حریت پسند خاک و خون میں نہا رہے ہیں۔

دوسروں پر رجعت پسندی اور بورژوائیت کا الزام لگانے والے پروگریسیو اہل قلم دن کی روشنی کی طرح عیاں اس ظلم پر خاموش ہیں،

افغانستان میں ہزاروں انسانوں کا خون بہا کر ان کی جائدادیں ضبط کر کے، انہیں ملازمتوں سے بیدخل کر کے اور نان شبینہ کا محتاج کر کے جو بار کسی انقلاب آیا ہے اسے "عوامی انقلاب" "نئے دور کا سنہرا آغاز" کا نام دیا جا رہا ہے، اگر اتنی خونریزی کر کے کوئی اسلام کا علمبردار برسر اقتدار آتا تو ترقی پسند حضرات آسمان سر پر اٹھا لیتے۔

بھٹو کے دور حکومت میں عوام پر جو ظلم و ستم ہوا، مخالفین کو جس طرح کچلا گیا، پریس اور ذرائع ابلاغ کو جس طرح اپنی کنیز بنایا گیا، مخالف نقطہ نظر رکھنے والے دانشوروں، صحافیوں، طلبا اور مزدوروں پر جو ظلم و تشدد ہوا اس پر ترقی پسند حلقہ سے کوئی احتجاجی آواز بلند نہیں ہوئی، البتہ ایک غیر سیاسی قتل کے جرم میں جب اسے پھانسی کی سزا اصول عدالت کے ججوں پر مشتمل فل بنچ نے سنائی تو اس پر احتجاج کا ایک طوفان اٹھایا جا رہا ہے، یہی پروگریسیو اور پرولتاری ذہن اس وقت خاموش رہا جب مصر میں اخوان کے رہنما سید قطب، محمد فرغلی، یوسف طلعت، عبد القادر عودہ کو جرم بے گناہی پر سزائے موت دی گئی تھی ان میں ہر فرد اخلاق و دیانت، اور ملک و معاشرہ کی خدمت میں اپنی مثال آپ تھا جن کے قلم نے علم و ادب میں گراں قدر اضافہ کیا تھا۔ حال ہی میں برما سے دو لاکھ مسلمان جلاوطن کئے گئے، آج بھی یہ ستم رسیدہ، قتل و خون، آتشزنی اور آبروریزی کے سنگین مراحل سے گذر رہے ہیں، پہاڑوں اور گھنے جنگلات میں برمی فوج کے ظلم و بربریت سے بچنے کے لئے روپوش ہیں، یہ خالص انسانی ہمدردی کا مسئلہ ہے، ایسا سنگین واقعہ برصغیر میں ہو رہا ہے، لیکن ہمارا پروگریسیو پریس اور پرولتاری دانشور طبقہ پاکستان میں مجرموں کو کوڑوں کی سزا دئے جانے پر سراپا احتجاج بنا ہوا ہے۔ اور حکومت برما کے ظلم

ترقی پسندوں کی یہ "رجعت پسندی" بھی مثالی ہے کہ اپنے ولی نعمت روس کے بڑے سے بڑے ظلم و ناانصافی کی وہ تاویلیں کرتے ہیں، اور ہر طرح اسے JLLtif Y کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دنیا کا یہ واحد ملک ہے جہاں خیالات کو بیڑی پہنا دی جاتی ہے پابند سلاسل کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ژواگو اور گینزورا ڈ کے تخلیق کاروں کے ساتھ روس میں کیا سلوک ہوا، جن کے قلم سے کمیونسٹ نظام سے بے اطمینانی کے چند جملے نکل گئے، ان کے سر قلم ہوئے۔ اپنے مخالفین پر سائبیریا کی دوزخ کے دہانے کھول دئے گئے، اسٹالین کے دور اقتدار میں روس کا "پابند ادیب" اور ہندوستان کا "آزاد ترقی پسند قلم کار" دونوں اس کو انسانیت کا نجات دہندہ لکھتے رہے، خروشچیف نے جب اسٹالن کی سفاکی کا پردہ چاک کیا تو عقل و انصاف کا تقاضہ تھا کہ اس نظام پر سے اعتماد و یقین تنزلزل ہو جاتا، لیکن دوسروں پر "اندھے مقلد" کی پھبتی کسنے والوں کے اشتراکی نظام پر ایمان و یقین میں کوئی کمی نہیں آئی۔

انسان کو عقل و شعور کی جو نعمت عطا کی گئی اس کا صحیح استعمال اگر دانشوروں، ادیبوں اور صحافیوں کو نہ آیا، پاسداری اور جانبداری کا مرض ان میں بھی سرایت کر گیا، انسانی احساسات و جذبات، حق و انصاف کے تقاضے انہی کے ہاتھوں پامال ہوتے رہے تو اس دنیا کا اور انسانیت کا مستقبل کیا ہوگا۔؟

ظلم و ناانصافی کا مرتکب اگر کوئی "کامریڈ" ہو تو اسے عدل و انصاف کا نام نہیں دیا جا سکتا، یہ بات انہیں کون سمجھائے جو مسائل کو انسانیت و اخلاق، حق اور انصاف کے ترازو میں نہ تولیں بلکہ مخصوص نظریاتی عینک سے ہر واقعہ کو دیکھنے کے عادی ہوں۔

مذہب وہ بنیادیں فراہم کرتا ہے جو انسانیت کو نوازتی ہیں، انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں اور حق و راستی کو پنپنے، پھولنے اور پھلنے کا موقع دیتی ہیں۔

محسن انسانیت نے ایک بار فرمایا "انصر اخاک ظالما کان او مظلوما" (اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم)۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مظلوم بھائی کی مدد تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ظالم بھائی کی مدد کیونکر ہو؟ حضورؐ نے فرمایا کہ اسے ظلم سے روکنا یہ اس کی مدد ہے۔!!

تعلیم القرآن

از: مولانا محمد اویس ندوی مرحوم

پاکی کا ادب

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (مائدہ ۲) اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔

پاک اور صاف رہنا بڑی ضروری چیز ہے، دین کی جڑ پاکی ہی پر ہے۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک قبر کے پاس سے گذرے تو فرمایا کہ اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے بچتا نہ تھا۔ حضرت عثمان (اللہ ان سے راضی ہو) کو پاکی کا اس قدر خیال تھا کہ جب سے اسلام لائے، عام طور سے ایک بار، روزانہ غسل کرتے تھے۔

۱۔ حضورؐ نے فرمایا، جب کوئی شخص سو کر اٹھے، تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے، کیونکہ سونے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے!

۲۔ دانتوں کی صفائی کے لئے فرمایا، اگر میری امت پر بوجھ نہ ہوتا تو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

۳۔ عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں پاخانہ نہ کرنا چاہیئے۔

۴۔ غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہیئے۔

۵۔ استنجا بائیں ہاتھ سے کرنا چاہیئے اور پانی کے ساتھ مٹی بھی استعمال کرنا چاہیئے۔

۶۔ ہفتہ میں ایک دن مسلمان کے لئے غسل کرنا، کپڑے بدلنا، خوشبو لگانا اچھا سمجھا گیا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ضروری ہے۔

لباس کا ادب

قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا (اعراف ۳) ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہارا ستر اور زینت کا سامان۔

لباس کے دو مقصد ہیں:

۱۔ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے۔

۲۔ انسان کے بدن کے جن حصوں پر دوسروں کی نظر نہیں پڑنی چاہئے وہ چھپے رہیں، مردوں کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ، عورتوں کے لئے سر کے بالوں سے لیکر ٹخنوں اور گٹوں تک کا حصہ، ستر ہے، یعنی ان کا دوسرے کے سامنے کھولنا جائز نہیں تنہائی میں بھی کھولنا اچھا نہیں ہے۔ ایک صحابی نے حضورؐ سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں، یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو، فرمایا، خدا تو دیکھتا ہے اس سے اور زیادہ شرم کرنا چاہئے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا، کبھی ننگے نہ ہو اس لئے کہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں جو برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو۔

۱۔ مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہ پہننا چاہیئے

۲۔ مردوں کے لئے عورتوں کا لباس اور عورتوں کے لئے مردوں کا لباس جائز نہیں۔

۳۔ مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچا نہ کرنا چاہئے کہ ٹخنے چھپ جائیں، البتہ عورتیں دامن یا گھیر نیچے تک لٹکا سکتی ہیں۔

۴۔ ایسا باریک کپڑا نہ پہننا چاہئے جس سے ستر دکھائی دے۔ عورتوں کے لئے خاص طور سے حضورؐ نے فرمایا کہ "کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں۔"

۵۔ مرد شوخ رنگ، خاص کر سرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں! سرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں۔ زعفرانی کپڑے درست نہیں۔

۶۔ مردوں کے لئے حضورؐ نے سپید رنگ کے کپڑے پسند فرمائے ہیں۔

محسنِ انسانیتؐ نے فرمایا

حکومت ابتدا میں بہت خوبصورت نظر آتی ہے لیکن انتہا میں باعثِ ندامت ہوتی ہے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال انکم ستحرصون علی الامارۃ وستکون ندامۃ یوم القیمۃ فنعم المرضعۃ وبئست الفاطمۃ۔

(رواہ البخاری مشکوۃ صفحہ ۳۲۰)

ترجمہ: ابو ہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب کہ تم امیر بننے کی حرص کرو گے حالانکہ تمہارے لئے امارت و حکومت قیامت میں باعث ندامت ہوگی اور حکومت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک دودھ پلانے والی عورت کی کہ ابتدا میں تو بہت پیاری لگتی ہے اور دودھ چھڑانے لگتی ہے تو وہی بہت بری لگنے لگتی ہے (یہی حالت حکومت کی ہے کہ ابتدا میں حکومت بہت دلفریب نظر آتی ہے لیکن جب اس کے نتائج سامنے آتے ہیں تو وہی بہت خوفناک بن جاتی ہے)

شرح: حکومت کی ابتدائی دلفریبی اور پھر اس کے عواقب کی بدنمائی جن اعتبارات سے شرعی نظر میں ہے ان کو آخرت سے غافل دماغوں کو سمجھانا بہت مشکل ہے لیکن سطحی طور پر جو بات موجودہ دماغوں میں آسکتی ہے وہ اتنی واضح ہے کہ کسی زیادہ غور و فکر کی محتاج نہیں بلکہ آنکھوں سے دنیا کے موجودہ واقعات دیکھ کر نظر آ رہی ہے، ایک حکمراں جب تخت حکمرانی پر بیٹھتا ہے تو ابھی وہ جم کر بیٹھنے بھی نہیں پاتا کہ موت سر پر منڈلانے لگتی ہے، یہ تو ہیں زمانہ کے انقلابات اور لوگوں کی بے عقلی کے ثمرات، لیکن اگر ان سے قطع نظر کر لی جائے تو پھر بھی ایک حاکم کا یہ فرض ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ یہ سوچے کہ کتنے لوگوں کی زندگی اور راحت کی ذمہ داری اس کے سر پر عائد ہوتی ہے جس سے موجودہ دور میں عہدہ برآ ہونا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے۔

اگر حکومت انسانوں کی جان و مال سے کھیلنے کا نام ہو جیسا کہ موجودہ لوگوں کی ذہنیت بن گئی ہے تو یہ بات تو دوسری ہے لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ ایک گھرانے کے والدین پر اپنے بچوں کی صحت، ان کی غذا، ان کی رہائش، ان کی تعلیم و تربیت کی کتنی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور صحیح طور پر ان کو انجام دینا ان کو کتنا مشکل ہوتا ہے تو صرف یہی نہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر نازک ذمہ داریاں چند افراد کی نہیں، بلکہ کروڑوں انسانوں کی اس کے سر عائد ہو جاتی ہیں، ان سب کو کامیاب طریقہ پر پورا کرنا کیا کوئی آسان بات ہے۔ لیکن حکومت کی چاشنی اور اقتدار کی ہوس ان سب کو ایسا فراموش کر دیتی ہے کہ گویا خدا کی مخلوق کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے جس کو وہ اپنی مرضی کے مطابق بدل کر اپنے مغرور نفس کو خوش کرتے رہتے ہیں، کیا حکومت اسی کا نام ہے؟ اسلام کا نہیں بلکہ انسانیت اور شرافت کا تقاضا یہی ہے، خوب یاد رکھئے کہ ایک حاکم کے بننے اور نہ بننے سے ایک ملک کا بگڑنا یا سنور جانا ہے، اگر سنور گیا تو اس سے بڑھ کر خوش قسمت کون ہے۔ اور اگر بگڑ گیا تو اس بدنصیب پر اس کے مرنے کے بعد بھی تاریخ لعنت کرتی رہتی ہے اس لئے عاقل شخص کب اتنی بڑی ذمہ داریوں کو خوشی کے ساتھ اپنے سر لے سکتا ہے، جن کی ادائیگی یقیناً انسان کے بس سے باہر ہے یہاں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ایک شوہر جو اپنی چند بیویوں پر صرف ایک ادنیٰ درجہ کی حکومت رکھتا ہے جب وہ اس کو ادا کرنے سے قاصر رہ سکتا ہے تو پھر یہ کتنا مشکل ہوگا کہ ایک حاکم کروڑوں انسانوں کے حقوق ادا کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب سے

تحریک "پیام انسانیت" کے بارے میں

ایک اہم انٹرویو

از: اسحٰق جلیس ندوی، مدیر "تعمیر حیات" ندوة العلماء لکھنؤ

س:- میں آج آپ سے تھوڑا سا وقت پیام انسانیت کی تحریک کے سلسلہ میں لینا چاہتا ہوں، خدا کے فضل سے ہندوستان کی چار ریاستوں مدھیہ پردیش، ہریانہ، پنجاب، راجستھان میں اس کے کامیاب دورے ہوئے، بہار کے شہر سیوان میں بھی اس کا عظیم جلسہ ہوا، ہندو مسلمانوں کی یکساں دلچسپی، عظیم تعداد میں شرکت، غیر مسلم فضلاء وعمائد شہر کا ذوق وشوق سے شرکت کرنا اور اپنے گہرے تاثر کا اظہار، جلسوں کا سکون اور نظم وضبط، ان جلسوں کی ایسی خصوصیات ہیں جو سالہا سال سے اس ملک میں دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے دل کی آواز، اور وقت کی ضرورت ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وسیع ملک میں (مسلسل تلخ تجربوں کے بعد بھی) خلوص اور بے غرضی کی سچی طلب اور قدر ہے اور یہاں کے معاشرہ کا ضمیر خوابیدہ کہا جا سکتا ہے، مردہ اور مفلوج نہیں ہے، اور خدا کی رحمت، انسانیت پر ہمیشہ سے جو اس کی نظر کرم رہی ہے اور انسانوں کی اندرونی صلاحیتوں سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اب جب کہ یہ تحریک اس منزل پر پہونچ گئی ہے، کہ ملک کے سنجیدہ اور تعلیمیافتہ لوگوں کی نظر اس پر پڑنے لگی ہے، اور ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی طرف سے دورے کی دعوت اور محبت وقدر کے پیام آرہے ہیں میں آپ سے ایک صحافتی انٹرویو کی ضرورت سمجھتا ہوں تاکہ اس کے اصل محرکات ومقاصد لوگوں کے سامنے آجائیں، اس کام کا آپ کو کیسے خیال پیدا ہوا، جبکہ آپکا اصل مزاج علمی وفکری ہے، اور مطالعہ وتصنیف (جس کے لئے سکون اور گوشہ نشینی کی ضرورت ہوتی ہے) آپ کی زندگی کا پسندیدہ مشغلہ ہے، جو جہاں تک مجھے علم ہے آپ کو وراثت میں بھی ملا ہے، اور ماحول نے بھی اس کو تقویت اور غذا بہم پہنچائی ہے، یہ کام سب سے پہلے آپ نے کب شروع کیا؟ کیا یہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا یا اس میں کچھ وقفے بھی آئے؟

ج:- مجھے اگرچہ صحافتی انٹرویو سے بہت کم مناسبت ہے، اور عام طور پر اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن پیام انسانیت کی تحریک کے اس مرحلہ پر نہ صرف یہ کہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا، بلکہ کسی درجہ میں اس کی ضرورت اور افادیت بھی محسوس کرتا ہوں بعض غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو رفع کرنے کے لئے بھی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کے پس منظر، محرکات ومقاصد، اور اسکے طریق کار پر روشنی ڈالی جائے۔

س:- سب سے پہلے تو میں اپنی وہ بات دُہراؤں گا کہ آپ کے لئے اس تحریک کا اصل محرک اور باعث کیا تھا؟

ج:- یہ بالکل فطری اور قدرتی امر ہے کہ آدمی اپنے اس گھر کی بربادی نہیں دیکھ سکتا جس میں اس کو رہنا ہے، اور جہاں اس کی عزیز متاع، اور زندگی کی پونجی ہے، اور جس کے بنانے اور سنوارنے پر اس کی اور اس کے اسلاف کی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں صرف ہوئی ہیں۔ ہر سلیم الفطرت بلکہ صحیح الفطرت انسان کا خاصہ ہے کہ جس کشتی پر وہ سوار ہے اس میں وہ کسی کو سوراخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس شاخ پر اس کا نشیمن ہے عقل وہوش کی موجودگی میں نہ اس پر خود تیشہ چلا سکتا ہے اور نہ کسی کو تیشہ چلانے اجازت دے سکتا ہے۔

روزمرہ کا مشاہدہ تھا، کہ یہ ملک تیزی کے ساتھ اخلاقی انارکی، بلکہ قومی واجتماعی خودکشی کی طرف جا رہا ہے، اخلاقی قدریں بے دردی کے ساتھ پامال کی جا رہی ہیں، خود غرضی بلکہ خود پرستی کا جنون (ان افراد کو مستثنیٰ کر کے جن پر مذہب و اخلاق کی کسی وجہ سے گرفت مضبوط ہے، یا جو زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہیں) سب پر سوار ہے۔ انسان کی جان ومال، عزت وآبرو کا احترام تیزی کے ساتھ رخصت ہو رہا ہے، حقیر شخصی فوائد کے لئے اجتماعی وملکی مفاد کو آسانی سے قربان کر دیا جاتا ہے، کام چوری، احساس ذمہ داری کا فقدان، رشوت خواری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، بے عنوانی یہ سب اسی درخت کے پھل ہیں، اور انہوں نے پوری زندگی کو عذاب بنا دیا ہے، اور ان کی وجہ سے ملک کے آزاد اور با اختیار ہو جانے کے بعد بھی اس میں جینے اور آزادی سے فائدہ اٹھانے کا مزہ نہیں رہا، یہ خرابیاں اور کمزوریاں انگریزوں کے زمانہ میں بھی تھیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انکے دور اقتدار اور نظام تعلیم کو ان کے پیدا کرنے، یا ان کو ترقی دینے میں بڑا دخل ہے، لیکن ایک بدیشی جابر طاقت، چوکس انتظامیہ، اور مجبوری وبے اختیاری نے ان کو بہت کچھ دبا رکھا تھا، ہانڈی کے اوپر سے اس سترپوش کے اٹھ جانے سے یہ خرابیاں اُبال اور بھاپ کی طرح نکل پڑیں، آزادی کی جنگ اور بدیشی جوئے کے اتار پھینکنے کی مصروفیت نے قومی تعمیر اور کردار سازی کی مہلت نہیں دی، ملک تو آزاد ہو گیا لیکن ضمیر اندر سے غلام تھا، برطانیہ یا کسی غیر ملکی طاقت کا نہیں، بلکہ ہوا وہوس، دولت وقوت، عزت واقتدار، اور تنگ نظری وتنگ دلی کا، اتنے بڑے ملک کے نظم ونسق، اور سیاسی پارٹیوں کی باہم کشمکش، اور کرسی اقتدار کی حفاظت نے اس کی مہلت نہ دی (اور چند کو مستثنیٰ کر کے) ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ذہن میں اس کی کچھ اہمیت بھی نہ تھی کہ وہ عوام سے رابطہ پیدا کر کے ان کے دل وضمیر کو بیدار کرنے کی کوشش کریں، ان کے اخلاقی حس کو تیز اور متحرک کریں اور جو باتیں ملک کے لئے حقیقی خطرہ بنی ہوئی ہیں انکی طرف متوجہ کریں، بہت انتظار کرنے کے بعد اپنی بے سروسامانی، تنہائی وبے اثری کا پورا علم واحساس ہونے کے باوجود ہم نے میدان میں آنے اور بلا تفریق مذہب وملت اس ملک کے رہنے والوں کے دلوں پر دستک دینے کا فیصلہ کیا، کہ جب کسی محلہ یا گاؤں میں آگ لگتی ہے تو کوئی اپنی کمزوری اور بے نوائی کو نہیں دیکھتا، گونگے بھی چلا اٹھتے ہیں، اور اپاہج بھی دوڑ پڑتے ہیں۔

س:- قبل اس کے کہ میں آپ سے یہ سوال کروں کہ آپ نے اول اول اس کام کی دعوت کب دی تھی؟ میں آپ سے اس سوال کی اجازت چاہتا ہوں کہ کیا آپ کے لئے اسکی گنجائش نہ تھی کہ آپ اپنے تصنیف وتالیف کے کام اور ندوة العلماء جیسے عظیم ادارہ کی خدمت وترقی میں مصروف رہتے، آپ شروع سے تبلیغی جماعت کے ایک اہم داعی، ترجمان اور اسکے مقاصد کے شارح اور مبلغ رہے ہیں اور آپ کو اس جماعت کے خلوص ومقبولیت، اس کے وسیع اور ہمہ گیر اثرات پر اطمینان کلی رہا ہے، پھر جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ ہندوستان کے کئی اہم تعلیمی وتصنیفی اداروں کی انتظامی کمیٹیوں کے رکن بھی سالہا سال سے چلے آرہے ہیں، آپ پوری یکسوئی اور اطمینان قلب کے ساتھ اپنے اسلاف اور بزرگوں اور استادوں کی طرح ان اداروں کی خدمت میں مصروف رہ سکتے تھے، میرے نزدیک کوئی شخص بھی جو آپ کے طبعی مذاق، صحت کی کمزوری اور خاندانی گوشہ پسندی سے واقف ہے آپ کو ملامت نہ کرتا، اور نہ اس سلسلہ میں آپ کا گریباں گیر ہوتا،

ج:- آپ نے بڑا اچھا سوال کیا اور بڑی خوبی سے میرے لئے، اپنے علمی کاموں میں انہماک اور اپنے میدان عمل کے انتخاب کے لئے عذر تلاش کر لیا، لیکن میں اپنے اس اندرونی یقین اور اس بدیہی حقیقت کو کیسے نظر انداز کر دوں، کہ کسی ملک اور دور میں بھی تعلیمی وتعمیری کاموں کے لئے (خواہ وہ کتنے مقدس، ضروری اور مفید ہوں) شرط ہے کہ اس ملک میں معتدل (NORMAL) حالات ہوں، جہاں کوہ آتش فشاں بار بار پھٹتا ہو، سائیکلون جلد از جلد آتے ہوں، سیلاب اپنی قہر سامانیوں کے ساتھ پورے پورے شہروں اور صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہو، وہاں تعلیمی وتعمیری کام کے لئے دماغی سکون، اور ولولۂ عمل کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے، یہ تو غیر اختیاری امور ہیں۔ اور ان پر کسی کا کوئی قابو نہیں، لیکن جہاں فرقہ وارانہ فسادات، انسان کُشی، اور انسانیت سوزی کے جنون کی لہریں اٹھتی ہوں، اور اچھے پڑھے لکھے انسانوں پر اعصابی (ہسٹریا) کے دورے جلد جلد پڑتے ہوں، جہاں دولت وقوت کے سوا کوئی حقیقت زندہ اور مسلم نہ مانی جاتی ہو، اور جیسا کہ میں نے ابھی سیوان کی تقریر میں کہا تھا کہ "یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے کہ انسانوں یا عمارت پر بجلی گر جائے۔ نیویارک کے پاور ہاؤس پر بجلی گری اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے، کسی مجمع پر چھت یا دیوار گر جائے، کوئی ہاتھی یا سانڈ مست ہو کر انسانوں کی جان لے لے، اس لئے کہ یہ سب بے شعور وبے ضمیر چیزیں ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک پڑھا لکھا آدمی کسی پڑھے لکھے آدمی پر گر جائے، جیسا کہ جمشید پور، راؤرکیلا اور رانچی میں ہوا، ایک ہی کالج میں پڑھانے والا استاد دوسرے استاد کے خون میں ہاتھ رنگ لے، طالب علم، طالب علم کی مخبری کرے، اور کسی سیاسی جماعت کا ایک رفیق دوسرے رفیق کا گلا کاٹے"۔

اور یہ دورے کسی وقت بھی معاشرہ پر پڑ سکتے ہیں، اور لوگ معمولی بات پر اپنا دماغی توازن کھو سکتے ہیں، وہاں کسی تعلیمی وتعمیری کام یا ادارے کے بقا کی ضمانت کب تک دی جا سکتی ہے، اور اس بے یقینی اور ہیجانی فضا میں کوئی تصنیفی یا فکری کام کیسے ہو سکتا ہے؟ بقول میرؔ ع

یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

میں تو سمجھتا ہوں کہ اس فضا میں ادب وشاعری اور فنون لطیفہ اور اقبال کے الفاظ میں "لذت کردار اور جرأت اندیشہ" کی بھی کیا گنجائش ہے؟

اور یہ تو ملک گیر اور وسیع پیمانہ کے حوادث ہیں، جہاں سوسائٹی اتنی مسخ (CORRUPT) ہو جائے کہ کسی کو بغیر رشوت دئے نہ اس کا حق ملے، نہ ریل پر وہ آرام سے سفر کر سکے، نہ طالب علم پڑھنے کی طرف متوجہ ہوں، نہ استاد پڑھانے کی طرف، انتظامیہ کے تمام شعبے بے عمل اور سست ہوں، پورے ملک میں وقت کی کوئی قدر وقیمت نہ ہو، سفر غیر محفوظ، اور قیام مخدوش ہو جائے، وہاں اس بگڑے ہوئے معاشرہ میں افراد کے لئے اپنے اصولوں پر قائم رہنا کب تک ممکن ہے؟

اس بنا پر میں اس بات کے سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اخلاقی سدھار کی مہم اور پیام انسانیت کی تحریک، ملک کے تمام دینی، تعلیمی، علمی کوششوں اور تحریکوں کے لئے ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے جس کے اندر رہ کر ہر کوشش کامیاب ہو سکتی ہے، اور اس کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پُرسکون اور معتدل فضا مہیا ہو گی۔ اسی لئے اس تحریک کو میں ہر تحریک کا خادم اور معاون سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک ہر دعوت وتحریک کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے، کم سے کم اس کی حیثیت وہ ہے جو کسی فراش یا سقہ، یا زمین برابر کرنے والے، یا شامیانہ لگانے والے کی ہوتی ہے، جس کے بعد کوئی جلسہ، یا اجتماع بھی ہو سکتا ہے، خواہ وہ خالص مذہبی نوعیت کا ہو یا تعلیمی بحث ومذاکرہ کا۔

س:- اب مجھے پوچھنے کی اجازت دیجئے کہ اس بھرے پُرے ملک میں جس میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے آپ ہی نے کیوں یہ ذمہ داری سمجھی کہ اس دعوت کو لیکر کھڑے ہوں؟ اور کسی کا انتظار کئے بغیر میدان میں آئیں؟

ج:- آپ کا سوال بالکل حق بجانب ہے، لیکن آپ خود صاحب علم ہیں، اور قرآن وحدیث اور سیرت نبوی پر آپ کی نظر ہے، آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان خالص اپنے مذہب کے رو سے بھی اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ جہاں کہیں ہو اپنے ماحول کی فکر کرے، شترمرغ کی طرح ریت میں سر دھنسا کر خطروں سے آنکھیں بند نہ کر لے، "اور سب خیریت ہے" کا سبق نہ دہرائے، مسلمان کو ہر جگہ بھلائی کا حکم دینے، اور برائی سے روکنے کا حکم ہے۔ اس کو سمجھنا چاہیے کہ وہ زندگی کی جس کشتی پر سوار ہے، وہ جب ڈوبے گی تو اس کو لے کر ڈوبے گی، اس کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس صورت حال کے لئے جو مثال دی ہے، اس سے بہتر مثال کم سے کم مجھے مذہبی واخلاقی لٹریچر میں نہیں ملی، آپ نے فرمایا کہ "ایک کشتی پر کچھ لوگ بالائی منزل پر سوار ہیں، اور کچھ نیچے کی منزل پر، نیچے پانی کا انتظام اوپر ہے، نیچے والے مجبور ہیں کہ اوپر جا کر پانی لائیں اور اپنی پیاس بجھائیں، پانی گرتا اور چھلکتا ضرور ہے، کشتی کے "بالانشینوں" کو اس سے کچھ تکلیف ہوئی، انہوں نے روک ٹوک کی، نیچے والوں نے کہا کہ پانی کے بغیر انسان کا گذارا نہیں، اگر اوپر والے پانی نہیں لینے دیتے، تو ہم نیچے کے حصہ میں سوراخ کر لیں گے، اور وہیں بیٹھے بیٹھے دریا سے پانی حاصل کر لیں گے، آپ نے فرمایا اگر اوپر والوں میں ذرا بھی سمجھ ہے تو وہ ان کو ایسا کرنے سے روک دیں گے، اور پانی لے جانے کی اجازت دیدیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور کشتی میں سوراخ ہو گیا تو نہ اوپر والے بچیں گے نہ نیچے والے"۔

بس ہم سب اسی کشتی کے سوار ہیں، یہ ہمارے ملک کی کشتی ہے، اگر خدانخواستہ ڈوبی تو نہ ہمارے ادارے بچیں گے نہ کتب خانے، نہ مقدس اور معمر رسیدہ افراد، نہ عالم نہ فاضل۔

س:- کیا آپ کو تحریک شروع کرتے وقت یہ خیال نہیں ہوا کہ مسلمانوں کے اس اخلاقی سدھار کی قیادت کی آواز لگانے اور اس کا جھنڈا ہاتھ میں لینے سے برادران وطن میں بدگمانیوں کا ایک طوفان کھڑا ہو جائے گا، اور مسلمانوں کو اس کے ذریعہ سیاسی مقاصد کے پورا کرنے کا الزام دیا جائے گا۔

ج:- جی ہاں یہ خطرات تو تھے لیکن خطرات اور اندیشوں کی بنا پر کوئی ضروری کام چھوڑا نہیں جا سکتا۔ جب یہ کام شروع کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ دلوں اور دماغوں کے دروازے بند نہیں ہیں، اور جب کوئی کسی آتش زدہ محلے یا گاؤں میں صدا لگاتا ہے آگ لگی ہے، آگ لگی ہے، تو کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ صدا لگانے والے کا مذہب کیا ہے، میں اس موقع پر اپنی ایک پرانی تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں، جو سنہ ۵۵ء کی ہے۔

"عالم انسانی کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ اغراض وتعصبات، قوم پرستی اور سیاسی مقاصد سے بالکل آزاد وبے تعلق ہو کر عام انسانوں کے سامنے وہ حقیقتیں رکھی جائیں، جن پر انسانیت کی نجات اور سلامتی موقوف ہے اور جن کو نظر انداز کر کے ہمارا یہ پورا تمدن اور پوری انسانی سوسائٹی اس وقت سخت خطرے سے دوچار، اور موت وزیست کی کشمکش میں گرفتار ہے، یہ حقیقتیں اپنے اپنے زمانے میں پیغمبروں نے بیان کی تھیں، اور ان کے لئے سخت جد وجہد کی تھی، یہ حقیقتیں اب بھی زندہ ہیں، لیکن سیاسی تحریکوں، مادی تنظیموں اور قومی خود غرضیوں نے گرد وغبار کا ایسا طوفان کھڑا کر دیا ہے کہ یہ روشن حقیقتیں ان کے اوٹ میں اوجھل ہو گئی ہیں، لیکن انسانی ضمیر ابھی مردہ، اور انسانی ذہن ابھی مفلوج ومعطل نہیں ہوا ہے، اگر پوری بے غرضی، پورے یقین اور پورے خلوص کے ساتھ، ان حقیقتوں کو عام فہم زبان اور دلنشیں انداز میں بیان کیا جائے، تو یہ انسانی ضمیر وذہن اپنا کام کرنے لگتا ہے اور بڑی گرمجوشی سے ان حقیقتوں کا استقبال

کرتا ہے، اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تقریروں میں اس کے دلی کی ترجمانی اور اس کے درد کا مداوی ہے۔"

آپ نے کم سے کم بھوپال کے صدر منزل، لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال، آگرہ کے سینٹ جارج کالج ہال، اندور کے ٹیگور ہال، بہرائچ کے ٹاؤن ہال، اور جنڈی گڈھ، جے پور، جونپور اور ناگپور کے عظیم جلسوں میں غیرمسلم بھائیوں کا گہرا تاثر اور ان کے ذوق و شوق کی کیفیت دیکھی ہے،

اصل بات یہ ہے کہ لوگوں میں موجودہ صورت حال سے بے اطمینانی، بیزاری کی حد تک پہونچی ہوئی ہے، تاریخ کا مسلسل تجربہ ہے کہ ایسے موقع پر وہ لوگ تو کم تعداد میں ہوتے ہیں جو اس صورت حال سے پنجہ آزمائی کے لئے میدان میں آجائیں، لیکن وہ لوگ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں، جو اس صورت حال کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں یا کم سے کم دل سے اس کو پسند کرتے، ان کے حق میں کلمۂ خیر کہتے، یا دل سے دعا دیتے ہیں، ایسے موقع پر کسی فرد یا جماعت کا میدان میں آنا شرط ہے، اگر کوئی میدان میں آنے کے لئے تیار نہ ہو، تو حالات کا یہ دھارا اسی رُخ پر بہتا رہتا ہے، اور یونان و روما کی شاندار تہذیبوں کی طرح وہ تہذیب یا معاشرہ بھی زوال کا شکار اور تاریخ کا قصہ ماضی بن کر رہ جاتا ہے،

س:۔ کیا آپ اس سوال کا جواب دینا پسند کریں گے، کہ مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ بھی اس دعوت و تحریک سے کچھ فائدہ پہونچے گا؟

ج:۔ آپ نے ذرا نازک سوال کیا ہے،

میرے نزدیک مسلمانوں کو من حیث الجماعۃ اس کا کچھ بھی فائدہ نہ پہونچے اور ملک کو فائدہ پہونچ جائے، جب بھی ان کو یہ کام کرنا چاہیئے، وہ اپنے دین و منصب کے لحاظ سے اس کے لئے مامور ہیں، اور ملک کے ہر فائدے میں شریک، لیکن میرے نزدیک مسلمانوں کے لئے اس ملک میں باعزت طریقے پر رہنے کا یہی راستہ ہے، کہ وہ اپنی افادیت ثابت کریں، اور اخلاقی قیادت کے اس خلا کو پُر کریں جو عرصۂ دراز سے اس ملک میں چلا آرہا ہے۔ کسی ملک میں کوئی اقلیت یا فرقہ اپنی واضح افادیت و ضرورت اور بے لاگ و بے غرض قیادت و دعوت کے بغیر عزت و اطمینان کے ساتھ نہیں رہ سکتا، اقبال نے صحیح کہا ہے۔ ؏

زندگی جہد است و استحقاق نیست

س: اب مختصراً یہ بتا دیجئے کہ آپ نے یہ کوشش کب شروع کی تھی؟ اور اس میں تسلسل یا کوئی وقفہ بھی آیا؟

ج: یوں تو میں نے تقسیم اور ملک آزاد ہو جانے کے بعد ہی سے اپنے ان خیالات اور ملک کی اخلاقی گراوٹ، اور بگڑتی ہوئی صورت حال پر اپنی گہری تشویش کا اظہار اپنے بعض مضامین اور رسائل کے ذریعہ کرنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون "ہندوستانی سماج کی جلد خبر لیجئے" کے عنوان سے نکلا تھا جس کا ہندی، اردو ترجمہ میں نے اس وقت ملک کے تقریباً تمام برسر آوردہ سیاسی رہنماؤں اور وزراء اعلیٰ کو بھیجا تھا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ یہ کوشش ۱۹۵۴ء کے آغاز میں شروع ہوئی، اس سلسلہ کی پہلی تقریر جس سے اس مہم کا آغاز کیا گیا، ۹ جنوری ۵۴ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں ایک ایسے اجتماع میں کی گئی، جس میں شہر کے سربرآوردہ حضرات اور غیرمسلم تعلیمیافتہ اصحاب کی خاصی تعداد شریک تھی، اسی زمانہ میں تبلیغی دورے کے ساتھ اس جزو کو شامل کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی مشرقی اضلاع کا ایک دورہ کیا گیا جس میں جون پور، غازی پور، مئو اور گورکھپور میں بڑے بڑے ملے جلے اجتماعات ہوئے۔ اس دورے کی تقریریں ایک مجموعہ میں جمع کر دی گئی ہیں، جس کا نام ہی "پیام انسانیت" ہے اس سلسلہ کا دوسرا نمبر "مقام انسانیت" کے نام سے شائع ہوا، لیکن کچھ ہی دن کے بعد اندازہ ہو گیا کہ اس کو تبلیغی دوروں کے ساتھ ملانا بعض غلط فہمیوں کا موجب ہو گا، ادھر یہ احساس غالب آنے لگا، کہ ایسی تقریروں کے لئے جن احتیاطوں اور رعایتوں کی ضرورت ہے ان پر سب کو قدرت نہیں، اس لئے ان تقریروں کا بوجھ زیادہ تر اس ناچیز پر اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی پر تھا، اور جہاں ہم نہ ہوتے وہاں اس طرح کا کوئی اجتماع بھی نہ کیا جاتا۔

اُدھر میرے بیرونی ملک کے سفر پیش آنے لگے کہ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہی مجھے دمشق یونیورسٹی کی طرف سے دعوت آئی، اور میں کئی مہینے کے لئے ملک سے باہر رہا، وہاں سے آنے کے بعد اپنے دوسرے تصنیفی و علمی مشاغل میں مصروف ہو گیا، واقعہ یہ ہے کہ مجھے ساری عمر اس کا قلق رہیگا کہ یہ سلسلہ کیوں نہ جاری رکھا گیا، میں اس کو اپنی ایک اخلاقی کوتاہی سمجھتا ہوں، اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس پر ہمارا محاسبہ نہ ہو، مجھے یقین ہے کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو رفقاء بھی تیار ہو جاتے، اور ملک کی فضا پر بھی اس کا ضرور اثر پڑتا، اس طویل وقفہ کے بعد دسمبر ۱۹۷۴ء کو الٰہ آباد سے پھر اس مہم کا آغاز کیا گیا، اور اس کے بعد سے کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے۔

س:۔ اب دو سوالات میں اور کرنا چاہتا ہوں، آپ نے اپنی علالت و تکلیف کے باوجود اتنے تفصیلی جوابات دیئے اور یہ انٹرویو میرے اندازہ اور توقع سے زیادہ طویل ہو گیا، میں اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ اس تحریک سے بعض حضرات کو بعض خدشات ہیں، ان میں سب سے بڑا خدشہ یہ ہے کہ کہیں اس سے وحدت ادیان کا فتنہ پیدا نہ ہو، آپ اس سلسلہ میں اگر کوئی وضاحت مناسب سمجھتے ہوں تو فرمائیں،

ج:۔ اس کا سارا انحصار داعیوں کی نیت، ان کے یقین و عزم، اور ان کے دعوت کے پیش کرنے کے طریقہ پر ہے، آپ کو معلوم ہے کہ میں شروع سے وحدت ادیان کا مخالف، اور وحدت حق کا قائل ہوں، ۱۹۴۶ء کے بعد ہی سے میں نے اس پر مضامین لکھنے شروع کئے اور ہر اس چیز کی مخالفت شروع کی جس سے مسلمانوں میں کسی دوسری تہذیب یا دعوت میں تحلیل ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا تھا۔ اس سلسلہ میں میں اپنے دو رسالوں کا حوالہ دوں گا، جن کا تعلق علی الترتیب ڈاکٹر سمپورنانند وزیر اعلیٰ ریاست یوپی، اور مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن صدر کانگریس و اسپیکر یوپی اسمبلی کی بعض تقریروں اور مضامین سے تھا، ایک کا عنوان "مسلمان اور ہندوستانی پروچ"، اور ایک کا نام "مذہب یا تہذیب" ہے درحقیقت یہ تحریک وحدت ادیان کی نہیں، وحدت انسان کی ہے، اس لئے ہم ان تقریروں میں اس سے امکانی حد تک احتیاط برتتے ہیں، کہ ان میں مذہب کی دعوت دی جائے، ہم صرف اخلاق، خدا ترسی، انسان دوستی اور اخلاقی اور شہری شعور کی دعوت دیتے ہیں، یوں سمجھ لیجئے کہ یہ اس غیرمسلم اکثریت کے ملک میں اس "حلف الفضول" کی ایک تقلید ہے جو بعثت سے قبل مکہ معظمہ میں ایک انجمن یا معاہدہ کی شکل میں قائم ہوا تھا، جس کے اہم دفعات یہ تھے، کہ "ہم ملک سے بے رخی دور کریں گے"، "مسافروں کی حفاظت کریں گے"، "غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے"، "زبردست کو زیردست پر ظلم کرنے سے روکا کریں گے"، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس میں شریک تھے، اپنے نبوت کے زمانہ میں فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی کوئی اس انجمن کے نام سے کسی کو مدد کے لئے بلائے تو میں سب سے پہلے اس کی امداد کو تیار پایا جاؤں گا۔

س:۔ اب میرا آخری سوال یہ ہے کہ بعض لوگوں کو یہ خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں اس تحریک کا ہندوستان کی دوسری دینی کوششوں سے تصادم نہ ہو جائے، یا یہ تحریک ان کو کچھ نقصان نہ پہونچائے جو عرصۂ دراز سے جاری ہیں، اور جنکے اثرات اور فوائد روز روشن کی طرح واضح ہو چکے ہیں۔

ج:۔ میں اس کو اندیشۂ دور و دراز" سے زیادہ وقعت نہیں دیتا، اس لئے کہ جیسا کہ میں نے کہا ہے، کہ یہ تحریک سب کے لئے مفید و معاون، اس کے لئے سازگار فضا پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، جس کے بغیر کوئی تحریک سکون و اطمینان کے ساتھ اپنا عمل نہیں کر سکتی، ہر کام کے لئے معتدل (NORMAL) حالات کی ضرورت ہے، اس کی ضرورت ہے کہ دماغ اپنا توازن نہ کھوئیں، طبیعتوں میں اشتعال، برہمی، اور بے جا بدگمانیاں نہ پائی جائیں، ان میں بات سننے کا موڈ اور اچھی بات کے قدر

(بقیہ صفحہ)

نقوش (اقبال نمبر) کا لاہور میں اجراء

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تقریر

محترم و مکرم تسلیم!

"تعمیرحیات" آپ میرے نام باقاعدہ بھیج رہے ہیں اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ لیکن شاید آپ کو میرا وہ خط نہیں ملا جس میں میں نے اپنا نیا پتہ لکھ کر آپ کو بھیجا تھا۔ یہ نیا پتہ اوپر درج ہے۔ کرم ہوگا اگر آپ آئندہ "تعمیرحیات" میرے نام سری نگر کے پتے پر نہیں بلکہ مندرجہ بالا پتے پر بھجوایا کریں۔

امید کہ آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔

نیازمند

جگن ناتھ آزاد

پس نوشت:

نقوش کے اقبال نمبر کی رسم اجراء کے موقع پر لاہور میں جو تقریر میں نے کی تھی "تعمیرحیات" کے لئے حاضر ہے۔

صدر محترم اور معزز خواتین و حضرات!

سیکڑوں سال کے واقعات مل کر تاریخ کا ایک لمحہ بناتے ہیں اور سیکڑوں سال کی تاریخ روایت کے ایک لمحے کو جنم دیتی ہے لیکن اس کلیئے میں مستثنیات بھی ہیں، جیسے دنیائے اردو میں "نقوش" جو اپنے پہلے شمارے کے ساتھ ہی تاریخ ادب کا ایک حصہ بن گیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک روایت بنتا گیا۔ "نقوش" کے بغیر اردو کی تاریخ ادب نامکمل ہے"۔ "نقوش" کے بغیر جرائد کا ذکر ادھورا ہے"۔ آج اس قلم کے جلوے ہندوستان میں ہر اُس جگہ سنے میں آتے ہیں جہاں اردو کے چار ادیب مل بیٹھتے ہیں۔

پاکستان میں تو ایسی لائبریریوں اور ایسے گھروں کی تعداد بہت ہوگی جہاں "نقوش" کی فائل پہلے شمارے سے تازہ ترین شمارے تک موجود ہو۔ لیکن ہندوستان میں بھی ایسے مرکزوں کی کمی نہیں جہاں آپ "نقوش" کا جو شمارہ چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔ خود اس خاکسار کی ذاتی لائبریری میں ایک مدت تک یہی کیفیت رہی اور جب ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۶ء تک کے قیام سری نگر کے دوران میں اس کا پانچ ہزار کتابوں پر مشتمل دہلی کا ذخیرۂ کتب دیمک کی زد میں آیا تو اکثر نادر اور قیمتی کتابوں کے ساتھ "نقوش" کے بھی متعدد شمارے ضائع ہو گئے، جن میں "پطرس نمبر"، "شوکت تھانوی نمبر"، "مکاتیب نمبر" اور "لاہور نمبر" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

خیر، یہ تو "نقوش" کی ادبی حیثیت کے ایک پہلو کی بات ہے جو میں کہوں یا نہ کہوں، اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ کہنا مجھے اس وقت یہ ہے کہ "نقوش" آج اس منزل سے آگے نکل چکا ہے۔ جب اس کا کوئی خاص شمارہ شائع ہو تو اسے اس کی رسم اجراء کی ضرورت محسوس ہو ــــ "نقوش" کے خاص شماروں کی رسم اجراء پہلے بھی ادا ہوتی رہی ہے، اور اس کی روداد پڑھ کے ہمیشہ مجھے یہ خیال آتا رہا ہے کہ مدیر صاحب کے اس رسمی تعارف کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں اور غالباً مدیر "نقوش" خود اس مصرعے کی معنویت کے قائل ہوں گے۔

لیکن میں آج کی رسم اجراء سے بہت خوش ہوں کیونکہ اگر مدیر "نقوش" محمد طفیل المعروف بہ محمد نقوش رسم اجراء کے بہانے یہ محفل نہ سجاتے تو دنیا بھر سے آئے ہوئے ادیب اور بالخصوص ہندوستان سے آئے ہوئے چار یار سرور، جعفری، صباح الدین اور یہ خاکسار پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں سے اس طرح کیسے مل سکتے جیسے اس محفل میں مل رہے ہیں مجھے تو اس وقت ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے کائنات مل گئی ہو۔ اس بہانے کیسے کیسے پرانے یار احباب مل گئے ــــ جی چاہتا ہے یہ نشست اسی طرح برسوں جمی رہے۔

اور ہاں یاد آیا۔ "نقوش" نے ۱۹۴۸ء سے لے کر اس وقت تک کتنے ہی نمبر نکالے تھے جو جادۂ ادب پر سنگ میل بھی بنتے چلے گئے اور چراغ راہ بھی۔ لیکن "اقبال نمبر" نہیں نکالا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ "نقوش" کے کارناموں میں یہ ایک کمی رہ گئی تھی۔ کیا مبارک لمحہ تھا وہ جب محمد طفیل کو اس کمی کا احساس ہوا، اور پھر اس کی تلافی کی تو اس شان سے کہ یکے بعد دیگرے تین نمبر نکال دئے اور اب چوتھا "اقبال نمبر" شائع ہونے والا ہے۔ میں جب اقبال عالمی کانگرس کے کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو ان میں وہ چار ضخیم جلدیں (سائیکلوسٹائل کئے ہوئے انگریزی اور اردو مقالات پر مشتمل جو سیمینار میں پڑھے گئے) سب سے وقیع کارنامہ نظر آتا ہے اور عالمی کانگریس سے باہر کے کام پر نظر ڈالتا ہوں تو نقوش کے چار "اقبال نمبر" (جن میں سے ایک کو میں ابھی تک اپنے تصور ہی میں دیکھ رہا ہوں) سب سے زیادہ بلند، سب سے زیادہ بڑا اور سب سے زیادہ باوقار کام نظر آتا ہے۔ اس موقع پر مدیر "نقوش" کی اس ادبی دیانت کی داد دیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ "نیرنگ خیال" کے اقبال نمبر کی اشاعت کو وہ اپنا کارنامہ قرار نہیں دے رہے ہیں اور "نقوش" کے اقبال نمبروں کی مجموعی تعداد کو چار نہیں بلکہ تین بتا رہے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۳۲ء میں "نیرنگ خیال" کے اقبال نمبر کا شائع ہونا ایک معجزہ نہیں تھا۔ آج اس لعل گم شدہ کو ماضی کی گہرائیوں سے باہر نکال کے لے آنا اور اسے اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ جوہریانِ ادب کے سامنے پیش کرنا ایک معجزہ ہے۔

ہماری دنیائے اردو ایسے معجزوں سے آشنا نہیں ہے۔ اس لئے میرے نزدیک "نقوش" کے اقبال نمبروں کی تعداد تین نہیں بلکہ چار ہے جس کے لئے میں سارے ہندوستان کی طرف سے مدیر "نقوش" اور ان کے رفقاء کار کو مبارک باد دیتا ہوں اور یہ بھی توقع رکھتا ہوں کہ "نقوش" کے اقبال نمبروں کا یہ سلسلہ نمبر چار (یا بقول طفیل نمبر ۳) کے بعد بھی ختم نہیں ہو گا۔ کیونکہ اقبال پر صحیح معنی میں کام تو اب شروع ہوا ہے۔

اقبال صدی تقاریب کے سلسلے میں

اقبال پر ایک نئی کتاب

"اقبال اور کشمیر"

مصنفہ

جگن ناتھ آزاد

قیمت ـــــ پندرہ روپے

میسرز علی محمد اینڈ سنز، بک سیلرز اینڈ پبلشرز

لال چک، سری نگر (کشمیر)

پاکستان کا مارشل لاء

از: مولانا محمد اسحاق صدیقی ندوی سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء حال ناظم دارالعلوم کراچی

پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ اور پیپلز پارٹی کے زوال کے بارے میں بھارت کے عوام بلکہ خواص بھی بہت کم واقفیت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ ریڈیو اور اخبارات دوسرے ممالک کے حالات معلوم ہونے کا سب سے زیادہ مقبول ذریعہ ہیں۔ عام طور پر لوگ انہیں پر اعتماد کرتے ہیں بھٹو کے دور میں اخبارات، رسائل، ریڈیو، ٹی۔ وی ابلاغ عامہ کے سب ذرائع پر حکومت کا کنٹرول تھا۔ اور اس کا ہاتھ ان کے گلے پر رہتا تھا۔ مضامین اور خبروں کا اشاعت سے پہلے سنسر ہوتا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ پیپلز پارٹی اور اسکی حکومت کی مرضی کے خلاف کسی بات کی اشاعت کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ پارٹی اور حکومت نے خود بھی ایسے اخبارات اور رسائل جاری کئے تھے جو بھٹو اور اسکی حکومت کے گن گاتے رہتے تھے۔

ریڈیو اور ٹی۔ وی پر تو حکومت ہی کا قبضہ تھا۔ ان دونوں اداروں میں وہی لوگ رکھے گئے تھے جو حکومت کی پالیسی سے متفق تھے۔ جن سے کسی اختلاف کا اندیشہ تھا انہیں نکال دیا گیا۔ مختصر یہ کہ ابلاغ عامہ کے ذرائع کلیۃً حکومت کے قبضہ میں تھے اور صحیح حالات کا اظہار غیر ممکن تھا۔ حکومت کے نام نہاد کارناموں کو ہزار گنا بڑھا کر ہر طرف اچھالا جاتا تھا اور اس کے گھناؤنے کردار کی پردہ پوشی کی جاتی تھی۔ سارا نظام جھوٹے پروپیگنڈے حقیقت پوشی اور ستم کیشی کی بنیاد پر چل رہا تھا۔

ان حالات میں بھی بعض باضمیر صحافیوں نے حکومت اور بھٹو پر تنقید اور ان کے ظلم و ستم پر صدائے احتجاج بلند کرنے کی جرأت کی۔ یہ لوگ قید و بند کی مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ اور صرف قید نہیں بلکہ ان پر پولیس نے اس قدر تشدد کیا کہ جسے سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ علما اور سیاسی قائدین میں سے جس شخص نے حکومت کی پالیسی یا بھٹو کے گندے کردار کے بارے میں لب کشائی کی اس کا بھی یہی حشر ہوا، اسے لرزہ خیز مظالم کا شکار بنایا گیا اور اس کے برخلاف جھوٹا پروپیگنڈا کر کے اس کی کردار کشی کی کوشش کی گئی۔ اپنے سیاسی مخالفین کو کچلنے کے لئے بھٹو کس قدر پستی پر اتر آتا تھا؟ اس کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ قومی اسمبلی کے ایک رکن چودھری ظہور الٰہی پر چند بھینسوں کی چوری کا جھوٹا مقدمہ قائم کیا گیا حالانکہ موصوف لکھو پتی شخص ہیں اس سے بھی زیادہ پست حرکت یہ تھی کہ بعض سیاسی مخالفین کو ان کی بہو بیٹیوں کے اغوا کی دھمکیاں دے کر ان کی زبان بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ سیاسی قتل معمولی بات تھی۔

سچ یہ ہے کہ بھٹو اور اس کی پارٹی کی گردن پر اس قدر خون ناحق ہے کہ ان کی سزا دینا بندے کی طاقت سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ان جرائم کی سزا دے سکتے ہیں۔ بھٹو کا دور ظلم و ستم بدنظمی و بدامنی کا دور تھا، اس نے اور اس کے رفیقوں نے ایسے مظالم کئے ہیں جن پر وحشت و درندگی بھی متحیر ہو جائے، پھر یہ کہ ظلم و جور اس شخص تک محدود نہ رہتا تھا جو ان کی نظر میں مجرم ہوتا۔ بلکہ یہ عام بات تھی کہ اگر ملزم ہاتھ نہ لگا تو اس کے اہل و عیال، یا بھائی بہنوں، والدین یا دوسرے اعزاء و اقارب کو گرفتار کر کے مبتلائے ظلم و عذاب کیا گیا۔ نام نہاد الکشن میں جو دھاندلیاں اس نے کی تھیں وہ پاکستان کے بچہ بچہ کو معلوم ہیں۔ اگر دھاندلیاں نہ کرتا تو اسے اقتدار بھی نہ حاصل ہوتا۔ اسے عوام کا منتخب نمائندہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو بددیانتی اور ظلم کے سہارے ان کے سروں پر مسلط ہو گیا تھا۔

بھٹو کی ذہانت اور سیاست دانی کی کہانی بھی مبالغہ آمیز اور صرف پروپیگنڈے کی رہین منت ہے۔ بقول فردوسی ۔

منش کردہ ام رستم پہلواں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

چار سو بیس کے مجرموں کی ایسی چالاکی اور ہوشیاری تو اس میں ضرور ہے مگر اس کے علاوہ کسی ذہانت کا اس میں نام و نشان بھی نہیں۔ سیاسی سوجھ بوجھ اور تدبیر کے لحاظ سے اسے معمولی سیاست داں کہا جا سکتا ہے۔ اچھا یا ممتاز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ نہ سیاست داخلہ میں کامیاب ہوا نہ سیاست خارجہ میں۔ دونوں میں ناکامی اس کا نصیب رہی۔ پاکستان کے بال بال کو اس نے قرضدار بنا دیا، اس کی غلط اور مضحکہ خیز، بلکہ طفلانہ خارجہ پالیسی کی وجہ سے پاکستان کا وقار دوسرے ملکوں میں بالکل گر گیا تھا اور اس کے منحوس دور میں اس مملکت کی کوئی وقعت نہیں باقی رہی تھی۔

داخلی سیاست میں ناکامی کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ اس کے اور اس کی پارٹی کے خلاف پاکستان کے ستانوے فیصد عوام متحد ہو گئے۔ اور اپنی جانیں قربان کر کے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس کی ظالم حکومت کے خلاف اس تحریک کو دیکھنے والے کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کے نظائر تاریخ میں بہت کم ملیں گے۔ جس طرح عوام نے جس طرح اس کی قوت و شوکت کو پامال کر کے اس کے اور اسکے اذناب کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔ اس کی مثالیں تقریباً معدوم ہیں۔ کسی حکمراں کے خلاف پورے ملک میں نفرت و حقارت کا اتنا زبردست طوفان اٹھنا، سیاسی فہم و بصیرت سے اس کی محرومی کی واضح دلیل ہے۔ انتظام مملکت اور ایڈمنسٹریشن سے تو اسے ذرہ برابر بھی مناسبت نہیں ہے۔ اس کا دور بدنظمی اور بدامنی کا دور تھا۔ کوئی شریف شہری بھی اپنی جان و آبرو اور اپنے مال کو محفوظ نہ سمجھتا تھا۔ البتہ غنڈے اطمینان کے ساتھ جرائم کا ارتکاب کرتے تھے۔ اسی کے زمانہ میں "غنڈہ ٹیکس" ایجاد ہوا۔ یہ ٹیکس بعض غنڈے شریف دوکانداروں سے وصول کرتے تھے۔ اور انکار کا جواب چھرے اور چاقو کی زبان سے دیتے تھے۔ ہاں ایک صفت بدرجۂ کمال پائی جاتی ہے کہ وہ قول و فعل میں ہر اخلاقی پابندی سے آزاد ہے۔ جھوٹ، بدعہدی اور مکر فریب میں اسے ید طولیٰ حاصل ہے۔ وہ اس میں اس قدر بیباک ہے کہ دیکھنے والا متحیر ہو جائے۔ اس میں نہ کسی اخلاقی اصول کی اسے پروا ہوتی ہے اور نہ اپنے وقار کی۔ آج بھی جرائم پیشہ اس کی حمایت کر رہے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جنھوں نے اس کے زمانہ میں ناجائز منافع حاصل کئے اس کے حامی ہیں۔ دو ایک زرخرید مولوی اور پیر صاحبان بھی اس کی حمایت کر کے حق نمک ادا کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستان کا ایک ایک فرد اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔ پاکستان کی پوری آبادی میں اس کے حامیوں کی تعداد بمشکل ایک فیصد ہو گی۔ انہی لوگوں کے جھوٹے پروپیگنڈے کی وجہ سے ہندوستان میں بھی بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔

پاکستان کی موجودہ مارشل لا حکومت سے عام طور پر لوگ مطمئن اور خوش ہیں۔ اس حکومت کے قیام سے امن و امان قائم ہوا، اور عوام کو سکون کی نیند نصیب ہوئی۔ جناب ضیاء الحق صاحب عوام و خواص میں مقبول ہیں۔ اور ان کا طرز عمل مخلصانہ ہے اگرچہ بعض سیاسی قائدین کی طرف سے الکشن کا تقاضا ہو رہا ہے۔ مگر جہاں تک عوام کا تعلق ہے انہیں اس بارے میں کوئی عجلت نہیں ہے۔

آخر میں یہ بات بھی کہہ دوں کہ پاکستان اور بھارت کا ہر سمجھدار اور محب وطن شخص خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم یہ رائے رکھتا ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کا خوشگوار ہونا دونوں کیلئے مفید اور ضروری ہے۔ بعض بیرونی طاقتیں دونوں کی دوستی کو پسند نہیں کرتیں۔ بھٹو بھی انہیں کا ہم نوا ہے۔ وہ اپنے دور اقتدار سے پہلے اور اس کے بعد ہمیشہ اسی کوشش میں مصروف رہا کہ ہند و پاک تعلقات میں کبھی خوشگواری نہ پیدا ہو سکے۔ اس کی اور اس کی پارٹی کی خواہش یہی رہتی تھی کہ دونوں ملکوں کے

(بقیہ ص۔۔)

نسیم حجاز

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(یہ تقریر جامعہ محمدیہ مالیگاؤں کے اس جلسہ میں کی گئی جو جمعیۃ اہل حدیث ایجوکیشنل سوسائٹی بمبئی کے زیر اہتمام ۱۶ر اپریل ۱۹۷۸ء کو جامعہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے موقعہ پر منعقد کیا گیا تھا، اس موقعہ پر جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ کے وائس چانسلر شیخ عبدالمحسن بن عباد جامعہ امام السعود ریاض کے پرو وائس چانسلر شیخ محمد بن عبداللہ العجلان، اور خلیج کی بعض ریاستوں کے نمائندے موجود تھے۔ ان نمائندوں کی عربی تقاریر کے بعد مولانا مختار احمد صاحب ندوی صدر جمعیۃ کی فرمائش پر مولانا مدظلہ، نے فی البدیہہ حسب ذیل تقریر اردو میں کی، جس کا مختصر ترجمہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری صاحب نے عربی میں پڑھ کر سنایا، سامعین پر اس تقریر کا گہرا اثر محسوس ہو رہا تھا، افسوس ہے کہ اس کا ٹیپ حاصل نہ ہو سکا، مولانا نے اپنے حافظہ پر زور ڈال کر اس کا متن لکھوا دیا، جو امید ہے کہ اصل تقریر سے زیادہ سے زیادہ مطابق ہوگا، اور اس میں اس کے اہم مضامین و خیالات آگئے ہوں گے، مقرر نے اس کو زیادہ مرتب طریقہ پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جو تحریر کا خاصہ ہے، عام افادیت و دلچسپی کے لئے یہ تقریر قارئین کے سامنے پیش کی جا رہی ہے)۔

خطبہ مسنونہ کے بعد،

حضرات! اقبال مرحوم نے دم واپسیں کے وقت بڑی حسرت سے کہا تھا ؎

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید

آج اقبال اگر زندہ ہوتے تو میں ادب سے عرض کرتا کہ "آید" اور بار بار "آید" آج مدینہ طیبہ اور گہوارہ اسلام سے تعلق رکھنے والے کئی معزز مہمان جمع ہیں، اس سے پہلے بھی بڑی بڑی تعداد میں علماء و عمائد عرب ہمارے اس ملک میں آئے، اور ابھی وہ منظر لوگ نہ بھولے ہوں گے جب آج سے ڈھائی سال پہلے ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن کے موقعہ پر ان کی اتنی بڑی تعداد اجلاس کے اسٹیج پر رونق افروز تھی، جتنی بڑی تعداد اس ملک میں اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی، یہ حجازی نسیم اب اس ملک کی طرف بار بار چلنے لگی ہے، جو صحرا کو گلستاں بنا دیتی ہے، آج بھی اسی نسیم کا ایک جھونکا آیا ہے اور مجھے اس وقت نواب سید صدیق حسن خان مرحوم (جن کی یاد کا آنا اس موقعہ پر قدرتی ہے) کے بڑے لیکن جواں مرد بھائی مولوی سید احمد حسن عرشی کے دو شعر بے ساختہ یاد آ رہے ہیں، جو حسب موقعہ اور حسب حال ہیں ؎

نسیم الصبا وافی سحیرا مطیبا
فقلت له اهلا و سهلا و مرحبا
کانک انفاس المسیح بعینها
فاحییت صبا لم یزل تطلبا

اسی طرح بے اختیار حماسہ کے شاعر کا شعر یاد آ رہا ہے ؎

الا یا صبا نجد متی هجت من نجد
لقد زادنی مسراک وجدا علی وجد

یہ نسیم حجاز اپنے ساتھ اس ملک میں کیا لے کر آئی، وہ سب جانتے ہیں، وہ سب سے بڑا تحفہ توحید خالص کے عقیدہ کا لے کر آئی جس سے یہ ملک ہزاروں برس سے ناآشنا تھا، جس کی برکت سے اس ملک کے باشندے ہر قسم کے تراشیدہ اور ناتراشیدہ معبودوں کی عبادت و بندگی سے آزاد ہوئے، اور انہوں نے خدائے واحد کے آگے سر جھکانا سیکھا، اور وہ اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے کے قابل ہوئے ؎

نے خدا ہا ساختیم از گاؤ و خر
نے حضور کاہناں افگندہ سر
نے سجود پیش معبودان پیر
نے طواف کوشک سلطان و میر

یہ نسیم حجازی پہلی بار اس ملک پر پہلی صدی ہجری میں چلی اور اس نے سب سے پہلے سندھ کا ریگستان اور بحر عرب کا وہ ساحل مستفید و متبرک ہوا۔ آپ کے اس صوبہ مہاراشٹر کو جس کے ایک حصہ میں یہ جلسہ ہو رہا ہے، یہ شرف حاصل ہے، کہ اس کے ایک مقام تھانہ میں ایک جلیل القدر تابعی اور حدیث کے اولین مصنفین میں سے ایک مصنف ربیع ابن صبیح السعدی (م ۱۶۰ھ) آسودہ خاک ہیں، اس طرح آپ کے اس صوبہ کو تبع تابعی ہونے کی سعادت حاصل ہے،

پھر یہ مختلف وقتوں میں ہندوستان کے رخ پر چلتی رہی، اور اس کو سرسبز و نہال کرتی رہی، اسی نسیم حجازی کا فیض تھا کہ یہاں مختلف وقتوں میں حدیث نبوی کی خدمت اس پیمانہ پر ہوتی رہی جس کا فیض حجاز و یمن اور عالم عربی تک پہونچتا رہا، اور وہاں کے علماء نے بھی اس کا لوہا مانا، مثال کے طور پر دسویں صدی میں علامہ علی متقی نے حدیث کا جامع ترین مجموعہ جو سیوطی کے مرتب کئے ہوئے مجموعوں کا مجموعہ ہے "کنزالعمال" کے نام سے مرتب کیا، جس کے متعلق اہل نظر کا قول ہے "ان للسیوطی منة علی العالمین وللمتقی منة علیه"۔ انہیں کے شاگرد رشید علامہ محمد طاہر پٹنی نے حدیث کے لغت (غریب الحدیث) پر وہ مایہ ناز کتاب لکھی جو اس وقت تمام اہل علم کا مرجع ہے، اس کے بعد وقتاً فوقتاً علم حدیث کی تصنیفی، تحقیقی، اور تدریسی طور پر خدمت ہوتی رہی، ان خادمان حدیث میں گیارہویں صدی کے مشہور عالم علامہ عبدالحق بن سیف الدین بخاری دہلوی اور بارہویں صدی کے امام شیخ الاسلام احمد بن عبدالرحیم جن کو عرف عام میں شاہ ولی اللہ دہلوی کہا جاتا ہے کا نام اور کام سب پر روشن ہے۔ خاص طور پر شاہ ولی اللہ صاحب ہی نے اس علم کا سکہ ہندوستان میں عام طور پر چلایا، اور حدیث کی ایسے مجتہدانہ اور محققانہ طور پر خدمت کی جس کی نظیر عالم عربی میں بھی نہیں پائی جاتی، مثال کے طور پر ان کی بے نظیر تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کا نام لیا جا سکتا ہے، جس کی نظیر اسلامی کتب خانہ میں نہیں ہے، یہاں جو اصلاحی و تجدیدی کوششیں ہوتی رہیں، وہ سب اسی نسیم حجازی کا فیض تھیں، ان کوششوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے اصلاح عقائد، دعوت توحید و جہاد کا مرتبہ سب سے بلند ہے جو تیرہویں صدی ہجری کی ابتدا میں شروع ہوئی اور سارے ہندوستان پر چھا گئی، مجھے خوشی ہے کہ مولانا مختار احمد صاحب ندوی نے بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ اپنے سپاسنامہ میں اس کا اعلان کیا ہے کہ، ان کی جماعت و تحریک کا سلسلۂ نسب و نسبت ان دونوں شخصیتوں سے ملتا ہے، فرع کو اپنی اصل کا یاد رکھنا بڑی شرافت اور وفاداری کی بات ہے، اور مجھے امید ہے کہ اس کے برکات ظاہر ہوں گے، ان کے اس اظہار حق کو صرف کہنے والوں ہی نے قلم بند نہیں کیا، بلکہ کراماً کاتبین نے بھی محفوظ کر لیا ہے، میں نے عالم اسلام اور ممالک عربیہ کا چپہ چپہ دیکھا ہے، کوئی علمی و دینی مرکز مشکل سے چھوٹا ہوگا جس کی میں نے بار بار زیارت نہ کی ہو، اور جہاں کے علماء اور دینی شخصیتوں سے میں شخصی طور پر واقف نہ ہوں۔ میں اپنی اس ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتا ہوں، کہ میں نے ان ملکوں میں اسلام کی آخری صدیوں میں کوئی ایسی شخصیت یا تحریک نہیں دیکھی جو حضرت سید صاحب اور حضرت شاہ اسماعیل صاحب اور ان کی تحریک کی ہم پلہ ہو، مجھے کوئی ایسا دینی مصلح اور داعی نہیں ملا، جو سید صاحب جیسا عالی ہمت، بلند نظر، صاحب تاثیر اور جامع کمالات ہو،

ابوسلمان شاہجہانپوری، کراچی

مولانا آزاد کے متعلق چند علمی کام

مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر پاک و ہند کی ایک بڑی باکمال شخصیت تھے، وہ ایک جید عالم دین، بلند پایہ ادیب، صاحب طرز انشا پرداز، شعلہ نوا خطیب اور جنگ آزادی کے صف اول کے رہنما اور جدید ہندوستان کے معماروں میں اعلیٰ مرتبے کے شخص تھے۔ انکی تصانیف اردو ادب، تاریخ، سیاست اور مذہب کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں انکی کئی کتابوں کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن آئے، ان کے مقالات و خطبات کے چند نئے مجموعے آئے، ان پر بعض نئی تحقیقی کتابیں بھی شائع ہوئیں اور انگریزی اور سندھی زبانوں میں ان کی چند کتابوں کے ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند کتابیں یہ ہیں جو ہندوستان اور پاکستان سے گذشتہ چند برسوں میں شائع ہوئی ہیں۔

۱۔ ترجمان القرآن: مولانا آزاد کی مشہور تفسیر ہے، پہلے دو جلدوں میں تھی اب بعض اضافوں کے ساتھ ۴ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اسکا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے کیا تھا جو تین جلدوں میں ایشیا پبلشنگ ہاؤس بمبئی سے چھپ گیا ہے۔ اردو کی پہلی جلد اور انگریزی کی ۲ جلدیں سندھ ساگر اکاڈمی لاہور سے بھی شائع ہوئی ہیں۔ بقیہ جلدیں بھی شائع ہو رہی ہیں۔

۲۔ تذکرہ: مولانا آزاد کی مشہور خود نوشت جس میں ان کے اپنے حالات سے زیادہ ان کے خاندان کے بعض بزرگوں کے حالات ہیں۔ دہلی سے اس کا نیا اڈیشن شائع ہوا ہے۔

۳۔ غبار خاطر: نواب حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ۔

۴۔ خطبات آزاد: مولانا آزاد کی پندرہ اہم تقریروں کا مجموعہ۔ یہ چاروں کتابیں ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ تذکرہ اور غبار خاطر کی ان اشاعتوں کی نقل پاکستان میں بھی کیجا رہی ہے۔ یہ تمام ۲ کتابیں اردو کے نامور ادیب اور محقق مالک رام نے مرتب کی ہیں۔

۵۔ مولانا ابوالکلام آزاد: مولانا کی شخصیت اور ان کی علمی قومی خدمات کے تعارف کے لئے یہ کتاب اردو کے مشہور شاعر اور ادیب عرش ملسیانی نے لکھی ہے اور پبلیکیشن ڈویژن، گورنمنٹ آف انڈیا نے شائع کی ہے۔

۶۔ نقد ابوالکلام: وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی (آندھرا) میں شعبہ اردو و فارسی عربی کے صدر ڈاکٹر رضی الدین احمد نے ۵۱۱ صفحات کی یہ ضخیم کتاب مولانا آزاد کے ادب کے بارے میں لکھی ہے اور مذکورہ یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

۷۔ ابوالکلام آزاد ــ احوال و آثار: مختلف اہل علم کے مضامین کا یہ مجموعہ جو مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت، افکار اور خدمات کے تعارف میں ہے۔ مولانا آزاد میموریل اکیڈمی لکھنؤ کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے مرتب مسعود الحسن عثمانی ہیں۔

۸۔ آئینۂ ابوالکلام: مولانا آزاد پر مختلف حضرات کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو عتیق صدیقی نے مرتب کر کے دہلی سے چھپوایا ہے۔

۹۔ پولیٹکل فلاسفی آف مولانا ابوالکلام آزاد: سری واستوا کی تحقیقی کتاب جو ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی ہے۔

۱۰۔ دی رول آف مولانا ابوالکلام آزاد ان پالیٹکس: آر بسرا یوپیا کی تصنیف جس کا ایک باب نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ میں ۲۲ فروری ۵۸ء کے اسپیشل نمبر میں چھپا ہے۔

۱۱۔ قومی آواز لکھنؤ: یوپی کا مشہور اردو روزنامہ جس نے ۲۷ فروری ۵۸ء کو آزاد نمبر شائع کیا۔

۱۲۔ نیشنل ہیرالڈ: ہندوستان کا مشہور انگریزی اخبار جو لکھنؤ اور دہلی سے بیک وقت شائع ہوتا ہے، مولانا آزاد کی ۱۹ ویں برسی کے موقع پر ایک نہایت شاندار اسپیشل نمبر شائع کیا۔ ۲۲ صفحوں میں تقریباً ۲۰ مضمون ہیں اور مولانا آزاد کی شخصیت، سیرت، افکار و خدمات، مولانا کے معاصر، تحریکات، رجحانات، تعلیم، ادب، فنون لطیفہ وغیرہ کے بے شمار پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

گذشتہ چند برسوں میں پاکستان سے بھی متعدد اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں اور بعض زیر اشاعت ہیں۔

۱۔ رسول رحمت: سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر مولانا آزاد کے نایاب مضامین و خطبات کا مجموعہ جو برصغیر کے مشہور صحافی اور صاحب قلم غلام رسول مہر نے مرتب کیا ہے۔

۲۔ انبیائے کرام: انبیاء کے متعلق مولانا آزاد کے مضامین کا مجموعہ۔ اس کے مرتب بھی مہر صاحب ہیں۔ یہ دونوں کتابیں شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کی ہیں۔

۳۔ ابوالکلام آزاد: غلام رسول مہر نے مولانا آزاد پر ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی۔ اس کے ۴ باب مکمل اور پانچواں ادھورا تھا کہ مہر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اب یہ تمام صفحات نقوش لاہور کے شمارہ جنوری ۱۹۷۲ء میں چھپ گئے ہیں۔ مولانا آزاد اور مہر صاحب دونوں مرحومین کے تعلق سے یہ ایک نادر اور اہم تحریر ہے۔

۴۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے بارے میں مولانا آزاد نے کیا کہا تھا؟ احمد حسین کمال کی تالیف جو انہوں نے مولانا آزاد کی تحریروں اور اپنے خیالات سے مرتب کی ہے۔ مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) اور مغربی پاکستان کے اتحاد کے انجام اور پاکستان میں مقامی اور غیر مقامی کے پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں مولانا کے خیالات۔

۵۔ جنگ آزادی کا ایک باب: اس کتاب میں محمد سرور صاحب نے نیشنلسٹ مسلمانوں خصوصاً مولانا آزاد کی سیاسی خدمات، ان کے اخلاص اور پاکستان کے بارے میں ان کے معقول رویے کا ذکر کیا ہے۔ سندھ ساگر اکاڈمی لاہور سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔

۶۔ ارمغان آزاد: اس کتاب میں ابوسلمان شاہجہانپوری نے الہلال سے قبل کے مولانا آزاد کے ۱۷ مضامین اور ان کا تمام دستیاب شدہ کلام جمع کر دیا ہے۔ یہ سلسلے کی پہلی جلد ہے۔ اسے کلیات آزاد (حصہ اول) کا نام دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ یہ کتاب آزاد اکیڈمی کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

۷۔ تحریک نظم جماعت مولانا ابوالکلام آزاد: برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے نظم و اتحاد اور سماجی، تعلیمی اور تہذیبی مسائل کے حل کے لئے مولانا آزاد نے ۱۹۱۴ء میں تحریک نظم جماعت شروع کی تھی جو اپنوں اور بیگانوں کی اندازہ ناشناسیوں کی بدولت ختم ہو گئی۔ اس تحریک کی جامع تاریخ ابوسلمان شاہجہانپوری کے قلم سے۔ زیر اشاعت۔

۸۔ ہندوستان میں ابن تیمیہ: پاکستان کے مشہور صحافی اور بلند پایہ سیاسی شاعر آغا شورش کاشمیری مرحوم مولانا آزاد کے بڑے عقیدت مند تھے، انہوں نے مولانا آزاد پر جامع کتاب لکھی ہے جو ہفت روزہ "چٹان" لاہور کیجانب سے شائع ہو رہی ہے۔

۹۔ افادات آزاد: مختلف ادبی، دینی اور تعلیمی و تہذیبی مسائل کے متعلق تقریباً پانچ سو سوالات کے جواب میں مولانا آزاد کے دو سو نایاب خطوط کا مجموعہ، یہ خطوط انکے کسی اور مجموعہ مکاتیب میں شامل نہیں۔ افادات آزاد کو ابوسلمان شاہجہانپوری نے مرتب کیا ہے اور محمد اجمل خاں پرائیویٹ سکریٹری مولانا آزاد کے قلم سے اس پر مقدمہ ہے۔

۱۰۔ حقیقت الجہاد: مولانا کے فقہی رسائل حقیقت الصوم، حقیقت الصیام وغیرہ کے سلسلے کا آخری رسالہ پہلی بار ...

ماہنامہ ذکری رامپور کا عظیم الشان سالنامہ

پسندیدہ نگارش نمبر

ترتیب :۔ محمد یوسف اصلاحی

ممتاز اہل قلم کی پسندیدہ نگارشات کا ایک دلآویز مجموعہ

نہ کوئی ایسا عالم اور مصنف نظر آیا جو شاہ اسماعیل شہیدؒ جیسا ذہین و ذکی اور مجتہدانہ دماغ کا مالک ہو، مصنف نزہۃ الخواطر نے ان کی عظمت کی ان الفاظ میں شہادت دی ہے، کہ "احد افراد الدنیا فی الذکاء والفطنۃ والشہامۃ وقوۃ النفس والصلابۃ فی الدین۔" اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ذرا مبالغہ نہیں، ان دونوں حضرات کا نام آنے پر بے اختیار غالب کا یہ شعر زبان پر آتا ہے کہ ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

لیکن حضرات! مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اسلام کی عالمگیری و آفاقیت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کا یہ کرشمہ تھا کہ یہ نسیم صرف اور ہمیشہ حجاز ہی سے نہیں چلی بلکہ یہ کبھی کبھی ان ملکوں سے بھی چلی ہے جو دولت اسلام سے مشرف ہوئے تھے، اور انہوں نے حجاز ہی کے نخلستانوں سے خوشہ چینی کی تھی،

علم حدیث اور علوم دینیہ کا تحفہ ہمیشہ حجاز ہی نے ہندوستان کو نہیں دیا، بلکہ کبھی کبھی ہندوستان جیسے دور دراز ملک نے یہ تحفہ حجاز کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ حدیث میں آیا ہے "امتی کالمطر لایدری اولہ خیر ام آخرہ" چنانچہ جب بعض سیاسی اور تعلیمی اسباب کی بنا پر خود مرکز اسلام میں یہ فن شریف ضعف و انحطاط کا شکار ہوا، اور وہاں اس کے نشر و اشاعت میں وہ عالی ہمتی و مستعدی باقی نہ رہی جو وہاں کا شعار تھی، تو ہندوستان کے عشاق علم حدیث نے وہاں پہونچکر اور مسند درس بچھا کر اس میں نئی تازگی اور نیا ولولہ پیدا کر دیا، علامہ علی متقی نے دسویں صدی میں مکہ معظمہ کو اپنی تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، بارہویں صدی میں شیخ ابوالحسن السندی الکبیر (متوفی ۱۱۳۸ھ) پھر انہیں کے ہم نام شیخ ابوالحسن السندی الصغیر (متوفی ۱۱۸۷ھ) نے مسند درس بچھائی، اور علماء حرمین و ہند نے ان سے استفادہ کیا، پھر ان کے شاگردوں نے اس سلسلہ کو جاری رکھا، تیرہویں صدی میں مسند الہند حضرت شاہ عبدالحق دہلوی اور ان کے شاگرد رشید حضرت شاہ عبدالغنی ابن حضرت شاہ ابوسعید مجددی دہلوی نے بیس برس تک مدینہ طیبہ میں بیٹھ کر حدیث کی خدمت کی، اور سیکڑوں آدمیوں نے ان سے اجازت و سند حاصل کی،

علاوہ بریں تیرہویں صدی کے اواخر اور چودہویں صدی کے اوائل میں ہندوستان فن حدیث کی تدریس کا سب سے بڑا مرکز بن گیا، اور طالبین علوم حدیث دور دور سے بلکہ خود حجاز و نجد سے یہاں اس فن کی تحصیل و تکمیل کے لئے آنے لگے، میں اس موقع پر صرف دو درسوں کا ذکر کروں گا جو طالبین علوم حدیث کا ملجا و ماویٰ بن گئے تھے، ایک علامہ حسین بن محسن انصاری یمانی کا جو بیک واسطہ علامہ محمد بن علی الشوکانی صاحب نیل الاوطار کے شاگرد تھے، اور جن کی سند قلیل الوسائط ہونے کی بنا پر خاص امتیاز رکھتی تھی، انہوں نے بھوپال میں بیٹھ کر سالہا سال درس دیا اور ہندوستان کے وہ علماء جو خود مرجع تلامذہ اور کامل الفن تھے، استفادہ اور تکمیل کے لئے پروانہ وار جمع ہو گئے، مثال کے طور پر نواب صدیق حسن خاں، مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا شمس الحق ڈیانوی، مولانا حافظ عبداللہ غازیپوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے درس کی یہ خصوصیت تھی کہ حجاز و نجد کے علماء نے بھی شد رحال کر کے ان سے تلمذ کا شرف حاصل کیا، ان بیرونی علماء میں شیخ طیب بن الصالح مکی، شیخ ابوالخیر احمد بن عثمان مکی، اور الشیخ الصالح اسحاق بن عبدالرحمن النجدی کا نام لینا کافی ہے۔

دوسرا درس جو بین الاقوامی حیثیت رکھتا تھا مولانا سید نذیر حسین صاحب کا درس تھا، جن کو اللہ نے جلیل القدر تلامذہ نصیب فرمائے، جو کئی ہزار کی تعداد میں ہیں، ان میں مولانا سید عبداللہ غزنوی مولانا عبدالجبار غزنوی جیسی بابرکت ذات بھی ہے، جن کے متعلق صاحب نزہۃ الخواطر کا قول ہے کہ، "المتفق علی ولایتہ وجلالتہ" نیز مولانا غلام رسول قلعہ میہان سنگھ جیسے داعی الی اللہ اور مخلص، مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی، ناشر علم حدیث جنھوں نے پنجاب کو اساتذہ و علماء حدیث سے بھر دیا، مولانا شمس الحق ڈیانوی جیسے محقق و شارح حدیث، مولانا محمد بشیر سہسوانی اور حافظ عبداللہ غازیپوری جیسے مستعد و لائق استاد و مدرس تھے، ان کے درس سے بھی بیرون ہند کے علماء اجلہ نے استفادہ کیا، جن میں شیخ عبداللہ بن ادریس سنوسی مغربی، شیخ بن ناصر مبارک نجدی، اور شیخ سعد بن حمد بن عتیق نجدی جیسے فضلاء شامل ہیں۔ (ہندوستان میں اس کے علاوہ بھی عظیم و وسیع درس حدیث تھے جن سے سیکڑوں ہزاروں علماء نے فائدہ اٹھایا، مثلاً گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، گنج مراد آباد میں حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی کے درس لیکن یہاں صرف ان درسوں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں بیرون ہند کے علماء شامل تھے، اور جن سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ علوم دینیہ اور علوم حدیث کے بارے میں ون وے ٹریفک اتجاہ واحد کا اصول ہمیشہ کارفرما نہ تھا بلکہ افادہ اور استفادہ کا عمل مسلسل جاری تھا)

حضرات! اس نسیم حجاز کا ہمارے ملک میں آنا ہر حال میں مبارک ہے،

آج پھر ضرورت ہے کہ اس ملک کو توحید کا، عدل و مساوات انسانی کا پیغام دیا جائے، اور پھر اس دعوت کی تجدید کی جائے جس کو مرکز اسلام اور گہوارۂ وحی کے داعی و مبلغ اور بے لوث علمبردار اور قائد لے کر آئے تھے، ہم اپنے ان معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کی آمد کو اس ملک کے لئے فال نیک سمجھتے ہیں۔

بقیہ: صفحہ ۶ ایک اہم انٹرویو

کی صلاحیت ہو، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ تحریک یہ مقصد پورا کرتی ہے۔

جہاں تک تصادم اور ٹکراؤ کا تعلق ہے تو ٹرین ٹرین سے لڑ سکتی ہے، موٹر موٹر سے ٹکرا سکتی ہے، لیکن ٹرین، اور کشتی یا جہاز میں کوئی ٹکر نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ ایک خشکی پر چلتی ہے، دوسری پانی میں۔

تحریک "پیام انسانیت" کے مخاطب بلا تفریق مذہب و ملت ملک کے تمام باشندے ہیں، اس کا موضوع انسانیت اور اخلاق ہے، اس کا مقصد اس ملک کے رہنے والوں میں زندگی کا سلیقہ اور شہریت کا احساس پیدا کرنا ہے،

آخر میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ میں ان حضرات کو اس تحریک میں شامل کرنے کے بارے میں کتنا محتاط ہوں جو دوسری دینی، دعوتی و تبلیغی تحریکات میں شامل ہیں، ان کے بارے میں مطمئن ہیں۔ اور مفید کام کر رہے ہیں، بلکہ میں عام طور پر ان کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اپنے کام میں پورے انہماک کے ساتھ لگے رہیں، اس کے بعد بھی اگر کسی کو مخالفت یا تصادم کا اندیشہ ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ وہم کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نیتوں کا جاننے والا، اور قلوب کی حفاظت کرنے والا ہے، فنعم المولیٰ ونعم النصیر۔

بقیہ صفحہ ۸ : پاکستان کا مارشل لا

درمیان لڑائی جھگڑا چلتا رہے۔

چنانچہ دونوں ملکوں کے ذمہ داروں کی ملاقات کے سلسلہ میں اس کی پارٹی نے رکاوٹیں ڈالنے کی امکانی کوشش کی، مگر وہ کوشش نہ عوام میں مقبول ہوئی اور نہ حکومت اس سے متاثر ہوئی۔

دین اسلام کو نقصان پہونچانے اور فسق و فجور، الحاد و زندقہ پھیلانے اور بداخلاقی بدکرداری اور بے حیائی کو رواج دینے کی جو کوشش وہ کرتا رہا اس کی تفصیل میں نے یہاں نہیں ذکر کی، کیونکہ یہ ایک مستقل اور طوالت طلب موضوع ہے۔

"تعمیر حیات" کی ایجنسیاں اپنے بقایا جلد ادا کر دیں۔

ناریلستان میں نخلستان بطحا کا سماں
دیکھنا ہے گر ان آنکھوں سے تو مالا بار چل

محمد خالد صدیقی ندوی غازیپوری، استاد جامعہ اسلامیہ بھٹکل

ساحل مالا بار جنوبی ہندوستان کا انتہائی زرخیز و شاداب علاقہ ہے جس کی مثال اگر ڈھونڈی جائے تو وادی کشمیر ہی کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ایسا پُر بہار علاقہ جو گوا سے تریوندرم تک پھیلا ہوا ہے ایک عظیم تاریخی ورثہ کا حامل ہے، یہی وہ علاقہ ہے، جس میں اسلام کی اشاعت سب سے پہلے عرب تاجروں کے ذریعہ ہوئی، اسلام کی روشنی کو انہوں نے اس خطہ میں پھیلایا چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس پورے علاقہ میں مسلمانوں کی کثیر تعداد آباد ہے۔ اور صدیوں پہلے آنے والوں کے باقیات آج بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ۔ ؏

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

سرزمین بھٹکل:

اسی ساحلی پٹی پر ایک مشہور و معروف قصبہ "بھٹکل" آباد ہے۔ یہاں کے لوگ اپنی قومی خصوصیات، دینی شغف اور تجارتی سرگرمیوں میں ممتاز ہیں۔ اس قصبہ کے تین طرف اونچے اونچے شاداب پہاڑ اور مغربی جانب، بحرۂ عرب کی موجوں کی آماجگاہ ہے۔ یہ پورا قصبہ ایک مسطح وادی میں آباد ہے، بیچ سے ایک چھوٹی سی ندی جسے شادلی کہتے ہیں، کسی شوریدہ سر کی طرح پہاڑ و ٹیلے اترتی ہوئی سمندر کی پہنائیوں میں غائب ہوجاتی ہے، یہی وہ تاریخی ندی ہے جس سے اسلام کے سپوتوں کا قافلہ اس معمورہ پر اترا تھا۔

اس اعتبار سے بھٹکل کی سرزمین انتہائی خوش قسمت ہے کہ اس کے لیل و نہار، شام و پگاہ نے نفوس قدسیہ اور قدآور شخصیتوں کو دیکھا ہے۔ گذشتہ مہینہ کے نصف آخر ۲۰ مارچ ۸۳ء کو جامع ازہر کے جید عالم شیخ ابراہیم مطاوع یوسف جو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں المبعوث الازہر ہیں، کی باریابی کا شرف اس قصبہ کو حاصل ہوا۔

مقررہ دن مولوی عبدالعلیم، مولانا فاروق صاحب ندوی، جماعت المسلمین منکی کے دو نمائندے اور راقم سطور پر مشتمل یہ پانچ نفری قافلہ منگلور کی طرف چل پڑا۔

بھٹکل اور منگلور کے درمیان کی مسافت تقریباً ایک سو پندرہ کلومیٹر ہے، ساڑھے تین گھنٹے میں یہ مسافت طے ہوئی۔ اسٹیشن پہونچتے ہی ٹرین آگئی، شیخ مصری عربی لباس میں ملبوس، سر پر طربوش ترکی ٹوپی پہنے ہوئے، ٹرین سے نیچے اترے مرحبا مرحبا کی صدائیں بلند ہوئیں، دوپہر کا کھانا شہر کے ایک متمول دیندار، کریم النفس، شیخ عبداللہ صاحب آزاد فیکٹری والے کے مکان پر ہوا۔ ظہر کی نماز فیکٹری کے قریب ہی کی مسجد میں ادا کی گئی اور پھر ہم رخصت ہوئے۔

منگلور:

ساحل مالا بار کا ایک مرکزی شہر اور اہم ترین بندرگاہ ہے، پورا شہر تقریباً پہاڑیوں پر بسا ہوا ہے، صفائی ستھرائی قابل تعریف ہے، جدید قسم کی عمارتیں بکثرت ہیں عیسائیوں کی بھی تعداد اچھی خاصی ہے مسلمان بھی اچھی تعداد میں ہیں۔ ان کی اکثر آبادی خلیج دنب پر واقع ہے۔ ہر طرف شاداب و سرسبز علاقہ نظر آیا، ناریل کے بکثرت باغات جو سال کے بارہ مہینے پھل دیتے ہیں۔ پھلوں سے لدے ہوئے نظر آئے۔ اس علاقہ میں کاجو، چھالیا، دارچینی اور کتھا نیز چرونجی کے بکثرت درخت دیکھنے میں آئے۔

اڈپی:

اڈپی منگلور کا مشہور تعلقہ اور کوکنی برہمنوں کی کثیر آبادی کا شہر ہے۔ چاروں طرف ناریل کے باغات ہیں۔ یہاں کے کوکنی باشندے آر۔ ایس۔ ایس کی تحریک سے بہت قریب اور حد درجہ شغف رکھتے ہیں۔ کانگریسی دور میں صرف اس شہر کے اندر آر۔ ایس۔ ایس کے ۱۴ مراکز تھے جو ایمرجنسی میں ایک حد تک معدوم ہوگئے تھے، جنتا حکومت بنتے ہی ایک محتاط اندازے سے صرف اُڈپی میں ۳۶ مراکز ہیں۔ اسکی تصدیق راشٹریہ سیوک سنگھ کے صدر بالا صاحب دیورس کی مہاراشٹر میں ۵ اپریل کی تقریر سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے، سارے ملک میں سنگھ کی سرگرمیوں کے لئے حالات سازگار ہوگئے ہیں اور شاکھاؤں کی تعداد جو پابندی سے قبل ۸۰۰۰ تھی اب بڑھ کر ۱۱۵۰۰ ہوگئی ہے۔

بدعت کی گرم بازاری:

مسلمانوں کی تعداد برائے نام ہے، ناخواندہ اور دین سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے بدعت کی کثرت ہے۔ جب ہم شہر کی جامع مسجد کو جارہے تھے تو گلیوں سے گذرتے ہوئے ایک ایسے گھر کے محاذاۃ میں پہونچے جو ہرے رنگ سے رنگا ہوا تھا، دوسری منزل کی چھت پر ایک سبز جھنڈا لہرا رہا تھا یہاں پر گورنمنٹ کالج کے پرنسپل جناب عبدالباطن صاحب بھٹکلی نے اس گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس گھر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر پیر اور جمعرات کو تشریف لاتے ہیں، بہت سے لوگ اس گھر سے عقیدت رکھتے ہیں اور متولیان کی معیشت کی ضمانت اس گھر کی حفاظت ہی پر موقوف ہے۔ کار مسجد کے دروازہ کے سامنے جا کر رکی حنفی مسلکی کی یہ مسجد تھی، امام صاحب فیض آباد کچھوچھہ کے قریب کے رہنے والے ہیں، مسجد کے بائیں جانب دو روز سے حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے نام پر گیارہویں شریف کی تقریب چل رہی تھی۔ رضا کاروں کی ایک بڑی تعداد مختلف کاموں میں مصروف نظر آئی لیکن عصر کی جماعت میں ان میں سے کوئی بھی شریک نہ ہوا۔ ؏

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

کندا پور:

عصر کے بعد ہمارا سفر پھر شروع ہوا۔ راستہ میں گاہے بگاہے چرچ کی عمارتیں بھی نظر آتی رہیں کیونکہ اس ساحلی پٹی پر عیسائیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اس علاقہ میں سنگ تراش زیادہ تر عیسائی ہیں۔ مغرب کے وقت کندا پور پہونچنا ہوا۔ یہ بھی مرکزی جگہ ہے۔ کوکنی برہمنوں کی کثیر تعداد یہاں بھی آباد ہے۔ منگلور اور بمبئی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں پر عالیشان ہوٹل واقع ہیں۔ جہاں ہمہ وقت کھانے پینے کی ساری چیزیں تیار ملتی ہیں۔ قیام کی سہولتیں بھی میسر ہیں۔ لیگزری بسیں عموماً انہیں ہوٹلوں کے سامنے کھڑی ہوتی ہیں اور مسافر اپنی ضرورت پوری کرکے عازم سفر ہوتے رہتے ہیں۔ قریب میں کوئی مسجد نہ تھی۔ ارادہ یہ ہوا کہ ساحل سمندر پر نماز ادا کی جائے گی۔ کندا پور سے نکلتے ہی سڑک بجائے شمال کے مغرب کی طرف مڑ جاتی ہے اور تھوڑی دیر میں ساحل سے ہوتی ہوئی گذرتی ہے۔ اس وقت سڑک کے مغرب میں سمندر اور مشرق میں کندا پور ندی ہوتی ہے۔ بڑا ہی خوشگوار دیدہ زیب و دلآویز منظر ہوتا ہے۔ شیخ مصری سے اس کا تذکرہ پہلے بھی کیا جاچکا تھا۔ وہ سراپا اشتیاق بنے بیٹھے تھے۔ جب کار ساحل پر پہونچی تو شیخ پھڑک اٹھے اور برمحل آیت قرآنی پڑھنے لگے جب تک کار دریا و سمندر کے درمیان سے گذرتی رہی وہ لطف لے کر پڑھتے رہے۔ وجعل بين البحرين حاجزا ءاله مع الله بل اكثرهم لا يعلمون - (اور اسی نے دو دریاؤں کے بیچ میں ایک حد فاصل بنایا کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے، بلکہ ان میں سے اکثر اس حقیقت سے ناواقف ہیں) تھوڑی دیر کے بعد سڑک ساحلی پٹی سے ایک فرلانگ دوری سے گذرتی ہے۔ وہیں سڑک کے بائیں طرف مغربی سمت میں ایک خوبصورت مسجد ہے۔ اسی میں مغرب کی نماز ادا کی گئی۔

نوائطی علاقہ:

کندا پور کے بعد سے نوائط برادری کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے، گنگولی، بیندور، شیرور، بھٹکل، منڈیشور، منکی اور دوسری میں نوائط برادری کی کثیر آبادی ہے، سب سے بڑی آبادی بھٹکل کی ہے۔

منکی:

منکی ساحل سمندر پر واقع ایک چھوٹا سا حسین و جمیل قریہ ہے۔ ناریل کے درخت بکثرت یہاں پائے جاتے ہیں۔ اس کے تین طرف پہاڑی سلسلہ ہے۔ یہاں کا سرخ ریت کا ساحل بڑا پیارا ہے۔ ایک پہاڑی حصہ سمندر کے اندر تک گیا ہوا ہے۔ یہاں کے پہاڑوں میں میگانٹ کے کافی ذخائر ہیں۔ پہاڑوں پر کتھا کے بکثرت درخت ہیں جس کی چھال سے کتھا تیار کیا جاتا ہے، اور بھی دوسرے معدنیات سے یہ علاقہ بھرا ہوا ہے۔

ہماری کار جب High way سے کٹ کر گاؤں کی طرف مڑی تو بستی کا بچہ بچہ اپنے مہمان کے استقبال میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ بستی سے باہر لوگوں نے ایک نفیس گیٹ تیار کر رکھا تھا جس پر اھلاً وسھلاً ومرحبا بکم لکھا تھا۔ کار وہیں روک دی گئی، عمائدین قریہ نے بڑھ کر شیخ کا استقبال کیا۔

بھٹکل روانگی:

منگل کی شب میں منکی میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ بروز بدھ صبح نو بجے شیخ مصری جامعہ اسلامیہ پہونچے۔ بھٹکل کے لوگوں نے شیخ کا زبردست خیر مقدم کیا۔ یہاں کا خاص معمول ہے کہ جب کوئی مقتدر شخصیت قدم رنجہ ہوتی ہے، تو سب سے پہلے اہالیان بھٹکل سلطانی مسجد کے پاس اکٹھے ہوکر استقبال کرتے ہیں۔ مشہور یہ ہے کہ اس مسجد کو سلطان ٹیپو نے تعمیر کیا تھا۔ اور سب سے پہلے قصبہ کے ایک ولی صفت بزرگ نے سلطان کے استقبال میں اسی مقام پر ایک جلسہ منعقد کیا تھا، بعدہٗ اسی مقام پر یادگار کے طور پر اس مسجد کی تعمیر عمل میں آئی۔ قدیم طرز کی بنی ہوئی یہ مسجد اپنے دامن میں بڑی وسعت رکھتی ہے۔

جامعہ آباد:

استقبال کے بعد جامعہ آباد جہاں جامعہ اسلامیہ ہے شیخ روانہ ہوئے۔ بھٹکل سے ۵ کیلومیٹر دور مغرب میں لب ساحل واقع ہے۔ اس جگہ چند سال پہلے کوئی آبادی نہ تھی، لیکن حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے جب چار پہلے جامعہ اسلامیہ کا افتتاح کیا تو اس علاقہ کا نام جامعہ آباد رکھا، اور اب جامعہ اسلامیہ کے مقابل میں ڈیڑھ دو سو گھر کی ایک نئی آبادی اسی نام سے موسوم ہے۔

جامعہ اسلامیہ بھٹکل:

جامعہ اسلامیہ کا قیام آج سے پندرہ سال پہلے ہوا۔ اس کی حیثیت پہلے ایک مکتب کی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ مدرسہ ترقی کی راہ پر گامزن رہا اور مولانا عبدالحمید صاحب ندوی کی سعی پیہم کے نتیجے میں دو چار برس کے اندر چہارم عربی تک درجات کھل گئے۔ فی الوقت ششم تک تعلیم ہورہی ہے۔ جامعہ کی ایک شاخ مکتب کی شکل میں قصبہ کے اندر ہے جہاں چوتھے درجہ تک اردو، ناظرہ، حساب وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے اس میں تقریباً ساڑھے تین سو طلبہ زیر تعلیم ہیں اور جامعہ اسلامیہ کے عربی درجات میں تقریباً سو طلبہ ہیں۔ جامعہ کا پورا نصاب دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی کا ہے حفظ کا بھی شعبہ ہے۔

جامعہ میں استقبال اور پروگرام:

نو بج چکے تھے۔ اساتذہ میں مولانا ارشاد صاحب ندوی، مولانا رمضان صاحب ندوی، مولوی ایوب صاحب ندوی، مولوی تفضیل صاحب ندوی، مولوی شفیع صاحب قاسمی، مولوی عبدالمتین صاحب جمالی، ماسٹر ظفراللہ خان، ماسٹر محی الدین مکا صاحب نیز راقم الحروف اور طلبہ نے مہمان کا پرجوش استقبال کیا۔

طلبہ جامعہ کی مسجد میں اکٹھا ہوچکے تھے۔ وہیں پر طلبہ کا پروگرام ہونے والا تھا۔ گیارہ بجے پروگرام شروع ہوا۔ طلبا نے عربی میں تقریریں اور مکالمے پیش کئے۔ طلبہ کی انجمن لجنۂ عربیہ کی جانب سے محمد حسین متعلم درجہ پنجم عربی نے خلوص و محبت اور جذبۂ عقیدت واحترام سے لبریز ایک سپاسنامہ پیش کیا، مسجد طلبہ اور حاضرین سے کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ شیخ کی تقریر شروع ہوئی جو ظہر کے وقت تک جاری رہی۔ جس میں شیخ نے اچھوتے انداز اور موثر پیرایۂ بیان میں عصری علوم اور اس کی مضرتیں، اسلامی علوم اور اس کی رفعتیں نیز اسلامی قدروں کی اہمیت اور ضرورت کا ذکر کیا۔

بھٹکل لائٹ ہاؤس:

عصر کی نماز نوائط کالونی کی مسجد میں ادا کی گئی۔ نماز بعد مختصر سا بیان ہوا۔ عصرانہ جناب محی الدین صاحب منیری کے دولت کدہ مسمّیٰ "منیری خانہ" پر تھا۔

عصرانہ سے فارغ ہوکر ہم سب ساحل کے کنارے لائٹ ہاؤس دیکھنے گئے۔ لائٹ ہاؤس بھٹکل کا گویا قطب مینار ہے۔ لب ساحل ڈیڑھ دو سو فٹ بلند پہاڑی پر واقع ہے۔ لائٹ ہاؤس کا مینارہ تقریباً ۵۰ فٹ اونچا ہے ایک ایک ہزار کے دو بلب نہایت قیمتی اور چمکیلے شیشوں کی ڈھال نما دو بلوریوں میں فٹ ہیں۔ لائٹ آن ہونے پر گردش کرنے لگتی ہیں۔ جس کی وجہ سے چاروں طرف ۱۸ میل کے حدود میں اس کی روشنی پہونچتی رہتی ہے۔ اس لائٹ ہاؤس کی تعمیر انگریزوں کے دور میں ہوئی۔ کیونکہ ساحل کے قریب ہی برطانیہ کا ایک بہت بڑا جہاز کسی سمندری پہاڑ سے ٹکرا کر تباہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ حکومت برطانیہ نے لائٹ ہاؤس تعمیر کیا تاکہ جہازوں کو اس سے رہنمائی ملتی رہے کیونکہ اس علاقہ میں سمندری پہاڑیاں بکثرت ہیں۔

لائٹ ہاؤس کا منتظم ایک مسلمان تھا، جس کا نام یوسف ہے۔ اس نے ایک ایک چیز کو دکھایا۔ اوپر بیٹھنے کی جگہ بھی ہے۔ دیر تک بیٹھے اس طرب انگیز، خوش آئند، مسکناب جادوئی منظر سے محظوظ و مسرور ہوتے رہے، شیخ مصری بار بار کہتے جاتے، واللہ تغیرت فکرتي عن الهند، (خدا کی قسم یہ منظر دیکھ کر ہندوستان کے بارے میں میرا نظریہ بدل گیا)۔ اس پر مولوی فاروق صاحب ندوی بیساختہ بول اٹھے، شیخ اسی لئے تو حضرت آدمؑ نے اسی خطہ میں قیام کیا تھا، یہ سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔

آب حیواں:

اسی پہاڑ کے مغربی دامن میں ایک میٹھا چشمہ ہے۔ یہ عجیب خدا کی قدرت ہے کہ اس چشمے سے ۵ فٹ کی دوری پر سمندر کا کھارا نمکین پانی جس کو منہ میں بھی رکھا نہیں جاسکتا اور وہیں پر یہ شیریں پانی ہمیشہ رواں رہتا ہے۔ مد کے وقت سمندر کی شوخ موجیں اس چشمہ کے بالکل قریب تک پہونچ جاتی ہیں۔ وہاں تک پہونچنے کا راستہ انتہائی دشوار اور پیچیدہ ہے۔ احتیاط کے ساتھ ہم سب اس چشمہ تک پہونچے۔

بھٹکل میں جلسۂ عام:

عشاء بعد ۹ بجے شب میں شہر کی جامع مسجد کے سامنے ایک عام جلسہ ہونے والا تھا، نماز سے فارغ ہوکر ہم سیدھے جلسہ گاہ پہونچے۔ تنظیم کی عمارت کے سامنے کار رکی۔ تنظیم بھٹکل کا سب سے پرانا ادارہ ہے۔ رفاہی سوسائٹی کے طور پر یہ ادارہ کام کرتا ہے۔ اس کے تحت ایک پبلک لائبریری بھی ہے۔ لائبریری کا معائنہ کرنے کے بعد جلسہ گاہ پہونچے۔ لوگوں کا اژدہام تھا۔

جلسہ کی کارروائی جامعہ اسلامیہ کے طالب علم عبدالباری فکردے کی تلاوت سے شروع ہوئی۔ اناؤنسنگ کی ذمہ داری راقم الحروف نے انجام دی۔ جامعہ میں طلبہ کا پروگرام بہت پسند کیا گیا تھا۔ لوگوں کی خواہش یہ تھی کہ اس پروگرام کو عوام کے سامنے بھی پیش کیا جائے۔ چنانچہ پہلے طلبہ کا تھوڑی دیر تک پروگرام چلتا رہا۔ بعدہٗ شیخ کی خدمت میں جامعہ اسلامیہ اور شہر کی جانب سے ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا جسے قدوی نے پڑھ کر سنایا۔ اس کا ترجمہ عبدالمتین صاحب جمالی نے کیا۔ سپاسنامہ میں لائق صد احترام مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اختصار کے ساتھ وہ ساری باتیں آگئی تھیں جن کا ذکر کیا جانا ضروری تھا۔ قوم نوائط کا تعارف۔ ان کی آمد اور معروفیات، دینی خدمات، جامعہ اسلامیہ کا قیام اس کی ضرورت۔ حاضرین گوش بر آواز ہوکر اس طویل سپاسنامہ کو سنتے رہے۔

اس کے بعد شیخ سے تقریر کی درخواست کی گئی۔ حمد و ثنا کے بعد شیخ نے جنوبی ہند میں علوم اسلامیہ کی اشاعت اور تعلیم دین کے جامعہ اسلامیہ جیسے ادارہ کے وجود پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم تمام دنیا کے مسلمان کلمۂ توحید، عقیدۂ رسالت اور قرآن کی وحدت کے باعث باہم ایک رشتہ میں منسلک ہیں۔ اس لئے آپ سے ملنے کی ہمیں فطری طور پر بڑی خواہش تھی، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج ہماری یہ خواہش پوری ہورہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کو ہر اعتبار سے ہر شعبہ میں ترقی عطا فرمائے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس خدا کو ہرگز نہ بھولیں، جس نے ہمیں ہر چیز سے نوازا ہے۔ اسی کی دعوت دینے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی آئے۔ یہی دعوت قرآنی بھی ہے، اور رسالت آخر الزماں کا لب لباب بھی ہے۔

دل کی بات:

شیخ کی مفصل و موثر تقریر کا شستہ اور شگفتہ انداز میں سلیس ترجمہ مولانا فاروق صاحب ندوی نے کیا۔ شیخ کے تکو موت نے ایک جوشیلی تقریر کی آپ نے کہا،

(بقیہ آئندہ)

ندوۃ العلماء — منزل بہ منزل — تیسری قسط

ندوۃ العلماء کا تیسرا اجلاس
منعقدہ - بانس بریلی

خلاصہ تقریر مولانا سید سلیمان صاحب پھلواروی

آج کل جس طرح یورپ سے عمدہ ساز و سامان آ رہے ہیں اسی طرح اندرونی بیماریاں دہریت، نیچریت، الحاد وغیرہ بھی بڑے زوروں سے چلا آ رہا ہے اور مسلمانوں کی کم علمی کے باعث یہ بیماریاں ہندوستان میں روز افزوں ترقی پا رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ نئے تعلیم یافتوں کو دہریت و نیچریت کی طرف سے اب ضرور روکا جائے کیونکہ غیر مقلدیت اور شیعیت سے اس قدر اندیشہ نہیں ہے جس قدر ہم کو اس زمانے میں نیچریت و دہریت سے اندیشہ ہے افسوس کہ اُدھر دہریوں نیچریوں کے رسالے الحاد و زندقہ سے بھرے چلے آتے ہیں اور ادھر سے معتزلہ جہمیہ کی رد کی کتابیں بھیجی جا رہی ہیں یہ اس وجہ سے کہ اس کے سوا ہم کو کچھ معلوم نہیں، نہ ہم مخالفین کے علوم سے واقف نہ ان کی تردید کا ہم کو سلیقہ، تو اب اس کا علاج کیا ہے؟ یہی دار العلوم کا قائم کرنا۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ دار العلوم جب قائم ہو جائے گا تو انشاء اللہ دہریت و نیچریت کو اسی زور سے روکے گا جیسے ہمارے بزرگوں نے فلسفۂ یونان کو روکا تھا۔

اس کے بعد ناظم کو رپورٹ سنانی چاہیے تھی مگر ضعف و علالت کی وجہ سے مجبور تھے، اس لئے جناب صدر انجمن صاحب کی اجازت سے مولانا سید عبد الحی صاحب مددگار ناظم اپنی کرسی سے اٹھے اور گذشتہ سال کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔

خلاصہ رپورٹ ناظم ندوۃ العلماء

حضرات! جس زمانے میں اس مجلس کی بنیاد قائم ہوئی تھی اس وقت اس کے دو مقصد اعلیٰ قرار دئے گئے تھے، ایک اصلاح طریقۂ تعلیم، دوسرا رفع نزاع باہمی، اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی دینی و دنیاوی بہبودی کا دار و مدار زیادہ تر انہیں دونوں مقصد پر ہے مگر مجھ کو دو برس کے تجربے کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض بعض لوگوں کو ان مقصدوں کی حقیقت کو سمجھنے میں مختلف قسم کی غلط فہمیاں ہوئیں باوجودیکہ اس کی تشریح عمدہ طور پر رُوداد سال اول و دوم کی تمہیدوں میں کر دی گئی ہے اور کوئی شبہ نہیں جو انہیں بعض عبارتوں سے حل نہ ہو جاتا ہو مگر چونکہ مجھ کو توقع دلائی گئی ہے کہ اس موقع پر ظاہر کر دینے سے لوگوں کے شکوک جاتے رہیں گے اس لئے اسے ظاہر کرتا ہوں۔ ندوے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مسلمانوں کو نفر اور آزادی کی تعلیم دی جائے یا شیعہ، سُنّی، مقلد، غیر مقلد میں اتحاد مذہبی پیدا ہو جائے اور عقائد و اعمال پر ایسا اثر پڑے کہ سنی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد ہو جائیں یا ہر مذہب کو حق یا ہر مذہب کو باطل سمجھیں یا ایک نیا مذہب معجون مرکب پیدا ہو اور علماء امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے باز رہیں حاشا و کلا!

ایک اہم مقالہ

اجلاس میرٹھ کی آخری نشست میں مولوی عبد اللہ صاحب انصاری، مولانا سید محمد شاہ محدث رامپوری اور مولانا ابو محمد عبد الحق صاحب حقانی کی تقریروں کے بعد ایک اہم تحقیقی مضمون مولوی شفقت اللہ صاحب بدایونی نے پیش کیا جس میں اعداد و شمار کے ذریعہ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا تھا اور ان کے طریقۂ کار پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:-

ان سب عیسائی فرقوں نے آپس کی رضامندی سے اپنے اپنے مقدور و استطاعت کے موافق کل ہندوستان اور برہما کو اپنے دین کی اشاعت کے لئے تقسیم کر لیا ہے، اور اپنے اپنے گروہ کے حدود اور وسعت کارروائی پہلے سے تجویز کر لی ہے، مثلاً پنجاب میں اسکاٹ لینڈ کا پریسبٹیرین چرچ اور راجپوتانہ اور ہندو ریاستوں میں آئرلینڈ کا رومن کیتھولک اور ممالک مغربی و شمالی میں زیادہ تر امریکہ کا میتھوڈسٹ چرچ وغیرہ۔

فقط ایک شاخ یعنی میتھوڈسٹ ایسکوپل آف امریکہ کی کارروائیوں کا مختصر حال یہ ہے (اس پر اوروں کو بھی خیال کر لینا چاہیے) کہ اس کے پادری تبت کے پہاڑوں کی بلند چوٹیوں سے لے کر ہند کی جنوبی منتہا راس کماری تک اور بلوچستان کے صدر شہر کوئٹہ سے جو انگریزی عملداری کی مغربی حد ہے، جزیرہ نما ملایا کی انتہا سنگاپور تک ۲۰ لاکھ مربع میل کی وسعت میں پھیلے ہوئے ہیں اور کوئی قصبہ کوئی قریہ ہندوستان میں باقی نہیں رہا جہاں اس فرقہ کا مشن نہ پایا جاتا ہو، اور ہر مشن کے متعلق اتنے گرجے اور شفاخانے اور چھاپے خانے اور زمینداریاں اور گرانٹ اور صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کے کارخانے اور مذہبی تعلیم کے مدارس ہیں جن کے شمار سے عقل حیران ہے۔

انہوں نے صرف مذکورہ بالا شاخ کے اعداد و شمار فراہم کر کے بتایا ہے کہ اس کے دو سو پچاس مشن ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں اور پھر ان شہروں کی تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ کس شہر میں کتنے مشن سرگرم عمل ہیں۔

یہ مضمون بڑا فاضلانہ اور مبصرانہ تھا، ناظم ندوۃ العلماء مولانا محمد علی مونگیریؒ نے فرمایا کہ

"یہ امور تمام اہل اسلام اور بالخصوص علماء کی نہایت توجہ کے لائق ہیں، غیر قوموں کی مستعدی اور کوششوں کو ملاحظہ کر کے بیدار ہوں اور اپنے پاک مذہب اسلام کی حمایت پر مستعد ہو جائیں۔ ندوۃ العلماء سے جو کچھ ہو سکے گا کرے گا"

اس اجلاس میں انجمن اسلامیہ جبلپور، مسلمانان اعظم گڈھ، انجمن اسلامیہ امرتسر، انجمن آل ہاشم رائے بریلی، جملہ مسلمانان فتحپور ہسوہ، انجمن حامی ندوۃ العلماء سلطانپور، انجمن اسلامیہ بدایوں، اہل اسلام بریلی نے ندوۃ العلماء کی خدمت میں سپاسنامے پیش کئے اس کی خدمات کی تحسین کی اور اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔

اجلاس کے موقع پر آئندہ اجلاس کی تاریخوں کا اعلان ہوا کہ ندوۃ العلماء کا اجلاس چہارم ۱۵، ۱۶، ۱۷ شوال ۱۳۱۳ھ ۲۱، ۲۲، ۲۳ مارچ ۱۸۹۶ء میرٹھ میں ہوگا۔

اسے ضرور پڑھیں! جن حضرات پر "تعمیر حیات" کے چندہ کی رقم بقایا ہے ان کو خطوط بھیجے جا چکے ہیں۔ بعض حضرات نے چار چار سال سے چندہ نہیں ارسال فرمایا جب کہ پرچہ ان کو برابر جاری ہے۔ خط کی اطلاع کے مطابق اگلا پرچہ جملہ بقایا کے مطالبہ میں بذریعہ وی۔ پی ارسال ہوگا۔

اگر آپ کا حساب خط کے مطابق نہ ہو تو فوراً اطلاع فرمائیں تاکہ حساب درست کیا جا سکے۔

جن حضرات کو خطوط مل چکے ہیں اور انہوں نے کوئی جواب ارسال نہیں فرمایا ہے وی۔ پی وصول کرنا ان کا اخلاقی فرض ہے۔

(منیجر)

مولانا محمد ثانی حسنی ندوی

تضمین بر اشعار فارسی شیخ سعدیؒ

الٰہی ہمارا تو ہی ہے خدا — ہے حاجت روا اور مشکل کشا
نہیں کوئی معبود تیرے سوا — تو داتا ہے دیتا ہے صبح و مسا
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

الٰہی یہ دنیائے حرص و ہوس — لبھاتی ہے ہم کو نفس در نفس
نداریم غیر از تو فریاد رس — توئی عاصیاں را خطا بخش و بس
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

جھکائے ہوئے سر ندامت سے ہم — ترے در پہ آئے ہیں با چشم نم
پھٹا غم سے دل لب پہ آیا ہے دم — کرم کر الٰہی کرم کر کرم
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

الٰہی نہیں کوئی تیرے سوا — جزیل العطا و مجیب الدعا
نگہ دار مارا ز راہ خطا — خطا در گذار و ثوابم نما
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

الٰہی ترا کام لطف و عطا — مرا کام رو رو کے تجھ سے دعا
ترا کام عفو و کرم بر خطا — خطا میں ہوں یا رب خطا در خطا
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

ترے در کے سائل ہیں اہل کرم — ہیں منت کشاں اہل دیر و حرم
خدایا بدولت مراں از درم — کہ صورت نہ بندد درے دیگرم
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

الٰہی ترے ہیں سبھی انس و جاں — ہے رحمت تری رحمت بے کراں
ہے تیری زمیں اور ترا آسماں — حکومت ہے تیری یہاں اور وہاں
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

وہ ہو جس کو فرمائے جس دم کہ کن — ممکن تو کہے گر تو ہو لم یکن
خدایا بعزت تو خارم مکن — بذل گنہ شرمسارم مکن
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

تو دانی کہ مسکین و بیچارہ ایم — فرو ماندۂ نفس امارہ ایم
خدایا مقصر بہ کار آمدیم — تہی دست و امید وار آمدیم
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

ہے یا رب تو مالک غنی و کبیر — میں ثاقبؔ ہوں بندہ ذلیل و فقیر
فقیرم بہ جرم گناہم مگیر — غنی را ترحم بود بر فقیر
کریما بہ بخشائے بر حال ما
کہ ہستم اسیر کمند ہوا

ضروری خط

مکرمی! سلام مسنون

"تعمیر حیات" آپ کی خدمت میں برابر بھیجا جاتا رہا ہے، امید ہے کہ ضرور ملتا رہا ہوگا اور آپ اسے ہر حیثیت سے پسند فرماتے ہوں گے، اس دینی و ادبی پرچے کے مصارف آپ حضرات کے تعاون ہی سے پورے ہوتے رہے ہیں، ادھر آپ نے کسی وجہ سے توجہ نہ فرمائی جس کے سبب آپ کا چندہ بر وقت نہ مل سکا۔

آپ کا حساب درج ذیل ہے، براہ کرم اپنا مطالبہ فوراً بیباق فرما کر "تعمیر حیات" کی توسیع و اشاعت میں تعاون فرمائیں۔ ہم آپ کے جواب کا بے چینی سے انتظار کریں گے۔

آپ کا حساب درج ذیل ہے:-

خریداری نمبر ______

بقایا	...... سے	...... تک	Rs
سال رواں	...... سے	...... تک	Rs
سال آئندہ	...... سے	...... تک	Rs
میزان			Rs

خط یا منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر اور مکمل پتہ مع کوڈ نمبر ضرور تحریر فرمائیں۔

منیجر

قارئین تعمیر حیات سے!

1. "تعمیر حیات" ہر ماہ کی ۱۰ر اور ۲۵ر تاریخ کو پوسٹ ہوتا ہے۔ اگر آپ کو وقت پر پرچہ نہ ملے تو اندر ہفتہ دفتر کو مطلع فرمائیں۔
2. آپ کا پتہ اگر غلط چھپ گیا ہے تو فوراً مطلع فرمائیں تاکہ تصحیح کی جا سکے۔
3. بعض حضرات کئی کئی مہینہ تاخیر سے چندہ ارسال فرماتے ہیں اور جب چند ماہ بعد دوبارہ مطالبہ کا خط جاتا ہے تو ان کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ لہذا تمام خریدار حضرات ختم خریداری کا زمانہ نوٹ فرمالیں، مطالبہ کے خط میں زمانہ خریداری درج ہوتا ہے۔
4. خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں ورنہ تعمیل میں دشواری ہوگی۔
5. منی آرڈر کوپن پر اپنا مکمل پتہ بھی تحریر فرمائیں اور خریداری نمبر بھی لکھیں۔
6. جوابی امور کے لئے جوابی کارڈ یا جواب کے لئے ٹکٹ ارسال فرمائیں۔
7. نمونہ کے پرچہ کے لئے ۵۰ پیسوں کے ٹکٹ کے ساتھ اپنا پتہ صاف صاف تحریر فرمائیں۔

پرنٹر، پبلشر، مسئول سید محمد حسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی